معصوم ششم

صدائے حضرتِ سجادؑ

محمد یوسف حریری

08 NOV 1993

یکے از مطبوعات

دار الثقافۃ الاسلامیہ پاکستان

۲-بی - ۵/۲ ــــ ناظم آباد ــــ نمبر ۲ ــــ کراچی

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

نام کتاب ____ صدائے حضرت سجادؑ

قلم ____ محمد یوسف حریری

ترجمہ ____ سید حسن امداد ممتاز الافاضل

ناشر ____ دار الثقافۃ الاسلامیہ

طبع اول ____ ۱۴۰۵ھ - ۱۹۸۵ء

تعداد ____ ۳،۰۰۰

طبع دوم ____ ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ - جون ۱۹۹۱ء

تعداد ____ ۱۰۰۰

فہرست

○ پیش لفظ ____ ۵

○ عاشور محرم اور امام زین العابدین علیہ السلام ۱۶

○ جنگ قادسیہ، عدو شود سبب خیر ____ ۲۰

○ امامؑ کی زندگی کا پہلا حصہ ____ ۳۲

○ امامؑ کی زندگی کا دوسرا حصہ ____ ۱۰۴

○ امام کا عطا کردہ منشور ____ ۱۰۸

○ امام کا اپنے منشور پر عمل ____ ۱۲۳

○ معاشرہ انقلاب کی راہ پر ____ ۱۶۸

○ امامؑ کا ادائیگیٔ فریضۂ حج ____ ۱۸۹

پیش لفظ

اسلام وہ دینِ مقدس ہے جس کو خداوندِ متعال نے اپنے بندوں کے لیے منتخب فرمایا ہے اور انسانوں کے لیے اپنی خوشنودی کے حصول کا واحد راستہ قرار دیا ہے۔ اس مقدس دین ہی پر عمل پیرا ہو کر انسان اپنی منزلِ مقصود جو کہ سعادتِ دارین ہے حاصل کر سکتا ہے۔

یہ دینِ مبین اسلام دو اجزاء پر مشتمل ہے، ان دو اجزاء سے مساویانہ تمسک اس قدر اہم ہے کہ ان میں سے ایک جزء سے بھی جدائی یا دوری انسان کو پورے دین سے جدا کر دیتی ہے۔ یہ دو اجزاء جن کا آپس میں اتنا گہرا تعلق ہے نظامِ شریعت یعنی قرآنِ کریم و سنتِ رسولؐ اور امامت و قیادت ہیں۔ اسلام کے ان دونوں بنیادی اجزاء سے یکساں وابستگی فرد و اجتماع کو منزلِ کمال پر لے جانے کا موجب

ہے۔ جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ نے وقتِ رحلت ارشاد فرمایا کہ:

"میں تمھارے درمیان دو گرانبہا چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ ایک تو اللہ کی کتاب ہے، جس میں ہدایت اور نور ہے۔ اسے نہ چھوڑنا اور اس پر اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑے رکھنا اور دوسرے میرے اہلبیت ہیں۔ میں اپنے اہلبیت کے بارے میں تمھیں خدا کی یاد دلاتا ہوں۔"

بعد وصالِ رحمۃ للعالمین لوگوں کے ایک بڑے گروہ نے اپنا تعلق صرف شریعت سے قائم کرنے کا اعلان کیا اور امامت و قیادتِ حقیقی کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ اس امامت کو کہ جس کو خود اللہ اور رسولؐ اللہ نے منتخب کیا تھا اور جس کی پیروی کی بارہا تاکید فرمائی تھی۔ جبکہ لوگوں کے ایک گروہ نے حکمتِ اسلام کا درک کرتے ہوئے قرآن اور امامت و اہلبیتؑ کو یکساں مقام دیا اور یوں حقیقتاً یہ ہی گروہ اسلام حقیقی پر کاربند رہا۔ اس گروہ نے امامت کو اس کے صحیح و حقیقی فلسفہ کے ساتھ پہچانا۔ اور مقدور بھر اہلبیتؑ کا ساتھ دیا۔ اس گروہ مقدسہ میں سلمانؓ، ابوذرؓ اور مقدادؓ جیسے اصحابِ رسولؐ شامل تھے۔ اس کے برخلاف ایک اور گروہ نے صرف امامت سے اپنی وابستگی کا دعویٰ کیا اور شریعت کو نظر انداز کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا۔ کہ وہ خود امامت کے صحیح خد و خال کا درک بھی حاصل نہ کر سکے۔ اور یوں ان لوگوں کی وجہ سے دنیا کے سامنے امامت کا ایک عجیب و غریب تصور آیا بالکل وہی تصور و مفہوم جیسا کہ نصاریٰ نے رہبانیت کا تصور پیش کیا تھا۔

امامت کے حقیقی مفہوم سے ناآگہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کو جو نقصان لوگوں کے ایک گروہ نے امامت کو مسترد کر کے پہنچایا وہی نقصان امامت کے اس غلط مفہوم کی ترویج کی وجہ سے اسلام کو پہنچا۔

ان لوگوں نے امامت کا یہ تصور اور مفہوم پیش کیا کہ، ائمہ کا حکومت اور سیاست سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ان لوگوں نے ائمہ کا فقط ایک مدرسِ اخلاق کی حیثیت سے تعارف کروایا۔ جس کا کام لوگوں کو درسِ اخلاق دینے کے سوا کچھ نہیں۔ یہ لوگ اپنے نظریہ کی حقانیت کے لیے ائمہ اہلبیتؑ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور ان کی احادیث وغیرہ کو قطع و برید کے بعد لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ امیرالمومنینؑ نے خلافت کو اپنے نعلین سے تشبیہ دی۔ اس طرح انھوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ائمہ اطہارؑ نے اپنے آپ کو ہمیشہ خلافت و حکومت سے دور رکھا اور ساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ائمہ اطہارؑ اپنے حق کے چھن جانے پر وسعتِ نظری کا ثبوت دیتے تھے۔ اور اپنے حق خلافت و حکومت کے حصول کے خواہاں نہ تھے۔ ایک طرف تو ان لوگوں نے اس طرح ائمہ کی حکومت و سیاست سے عدم دلچسپی کی تشہیر کی اور دوسری طرف ان مجاہدین کے خلاف جو بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومتوں سے برسرِپیکار رہتے تھے ـــــ ائمہؑ کی طرف سے احادیث جعل وضع کیں۔ دشمنانِ اہل بیتؑ نے بھی ان لوگوں کی عدم معرفت کی بنا پر ان سے خوب فائدہ اٹھایا اور یوں یہ افراد حق کو اس کے حقدار سے دور کرنے والے دشمنانِ اسلام و اہلبیتؑ کی سازشوں میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔

نہج البلاغہ کے خطبات اور ائمہ علیہم السلام کی زندگیوں کے حالات

کا اگر دقیق نظر سے مطالعہ کیا جائے۔ تو محسوس ہوگا کہ ائمہ نے خلافت اور سیاست کے بارے میں بالکل بھی وسعت نظری سے کام نہیں لیا اور ہمیشہ اپنے اس حق کے حصول کے لیے سرگرم عمل رہے اور اپنے کردار و اعمال کے ذریعہ ایسے حالات سازگار کرنے کی سعی پیہم کی کہ جن کے زیر اثر خلافت کو اس کے اصل مقام پر لایا جائے۔ امیرالمومنین ؑ اپنے مشہور خطبہ شقشقیہ میں فرماتے ہیں کہ:

"یہ خلافت کا غصب مجھ پر بڑا گراں گزرا اور میرے لیے
یہ حنظل سے زیادہ تلخ اور ناگوار ہے۔ میں اس وقت تک صبر
کروں گا۔ جب تک میرے موعد نہیں آجاتے۔"

اس خطبے میں امام ؑ نے عدم قیام کی وجہ انصار و اعوان کی کمی ظاہر کی ہے۔

اسی طرح امام جعفر صادق ؑ کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ۔

"آپ ؑ کے ایک صحابی سدیر نے کہا کہ آپ ؑ کو دو لاکھ افراد کی
حمایت حاصل ہے پھر بھی آپ ؑ خاموش ہیں۔ یہ خاموشی جائز
نہیں۔ تو امام ؑ نے جواب دیا کہ اگر میرے پاس اصحاب بدر کے
برابر بھی اصحاب ہوتے تو میں قیام کرتا"

اسی طرح امام سجاد ؑ کا فرمانا کہ:

"مکہ اور مدینہ میں ہمارے ساتھ بیس آدمی بھی نہیں ہیں"

لہٰذا آپ ؑ اپنی ایک دعا میں خدا سے مناجات کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"پالنے والے! مجھے بخش دے کہ میرے سامنے کسی پر ظلم ہوا
اور میں اس کی مدد نہ کر سکا"

اسی طرح جناب امیر ؑ نے اپنے ظاہری دور حکومت میں مارقین، ناکثین، قاسطین کی سرکوبی کا ارادہ کیا تو لوگوں نے مشورہ دیا کہ آپ ان لوگوں کو

اپنی حالت پر چھوڑ دیں۔ اس کے جواب میں آپ ؑ نے ارشاد فرمایا کہ:

"میں نے اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کیا ہے اور اس
نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میرے پاس دو ہی راستے ہیں اوّل ان
باغیوں کے ساتھ مسلح جنگ کروں اور یوں ان کو ختم کر کے
امت کو ان کے شر سے نجات دلاؤں اور مملکت اسلامی
کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچاؤں یا پھر دوسری صورت
میں دین پیغمبر ؐ سے کفر لاؤں"

غور طلب بات یہ ہے کہ ان منافقین سے جنگ کیا خلافت و حکومت کے علاوہ کسی اور معاملے پر تھی؟ دوسرے یہ کہ اپنے حق سے رضاکارانہ دستبرداری اختیار کرنا اور اس حق کے غاصبین سے وسعت نظری کا سلوک کرنے کا جہاں تک تعلق ہے تو وسعت نظری کا سلوک تو ان لوگوں سے کرنا تھا کہ جو مملکت کے صرف ایک چھوٹے سے خطہ پر بغاوت کر رہے تھے اور وہاں اپنی مرضی کی خلافت و حکومت کے خواہاں تھے۔ اور یوں ادھر ہم ادھر تم کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے حضرت امیر ؑ ان حضرات کے ساتھ صلح کر سکتے تھے لیکن جناب امیر ؑ نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ ان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ جناب امیر ؑ کا یہ اقدام اس بات کو آشکار کرتا ہے کہ آپ ؑ خلافت و حکومت کے معاملہ میں ذرہ برابر رواداری کے قائل نہ تھے۔ اور ایسی رواداری اور وسعت نظری کو عہد و پیمان الٰہی کے خلاف خیال کرتے تھے۔

ائمہ طاہرین ؑ کا اپنے حق کے حصول کے لیے جنگ مسلحانہ اور جہاد بالسیف سے گریز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ائمہ اپنے حق سے دستبردار ہو گئے تھے یا اپنے حق کے حصول کا خیال ان کے دل سے نکل گیا تھا اور یوں

انھوں نے اس معاملہ کو عدلِ الٰہی پر موقوف کر دیا تھا۔ بلکہ ائمہ کی اپنے حق کے چھن جانے پر یہ ظاہری خاموشی صرف اس وجہ سے تھی کہ آپ اپنے انصار و اعوان کی معقول تعداد نہیں پاتے تھے کہ جو اس راہ کی مشکلات میں آپ کا ساتھ دے سکیں اور جب کبھی بھی ائمہ کو ایسے اصحاب اور جانثاروں کی مناسب تعداد میسر ہوئی انھوں نے جہادِ مسلحانہ سے گریز نہیں کیا۔ امیر المومنینؑ نہج البلاغہ کے تیسرے خطبے کے آخیر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"اب مجھ پر حجت خدا تمام ہو چکی ہے اور میرے پاس کافی تعداد میں انصار و اعوان موجود ہیں۔ اب میں حق کا ساتھ دینے والوں کے ذریعہ حق سے منحرف ہو جانے والوں کے خلاف جہاد کروں گا۔"

امام جعفر صادقؑ نے اگر خلافت کو مسترد کیا تو اس لیے نہیں کہ وہ اس خلافت سے دلچسپی نہ رکھتے تھے بلکہ اس وجہ سے کہ پیش کش کرنے والوں کو آپ مخلص نہ پاتے تھے۔ لہٰذا امام نے پیش کش کرنے والے (ابی سلمہ) کے متعلق فرمایا کہ:

"وہ میرا شیعہ نہیں ہے بلکہ دوسروں کا شیعہ ہے مجھ میں اور ابی سلمہ میں کوئی تعلق و ارتباط نہیں ہے۔"

اسی طرح جب مامون نے امام رضاؑ کو خلافت کی پیش کش کی تو حضرت نے اس پیش کش کو معذرت کے ساتھ رد کر دیا۔ دوسرے مرحلے پر مامون نے حضرتؑ کو ولی عہدی کی پیش کش کی امامؑ نے اس پیش کش کو بھی مسترد کر دیا۔ مامون سے امام کا یہ انکار برداشت نہ ہوا اور اس نے امامؑ کو ایک واقعہ سنا کر اس کے ذریعہ امامؑ کو قتل

کی دھمکی دی۔ واقعہ یوں تھا کہ "جب خلیفہ دوم نے خلافت کے فیصلے کے لیے چھ رکنی شوریٰ نامزد کی اور کہا کہ اگر یہ افراد تین دن کے اندر اندر کسی بات پر متفق نہ ہوئے تو ان تمام کو قتل کر دیا جائے گا۔"

کیا کوئی شخص اس طرح کی پیش کش کو مخلصانہ سمجھ سکتا ہے کیا اس پیش کش کے پیچھے کوئی سازش کارفرما تھی؟ اسی طرح ائمہ کی ان کے گھروں میں نظر بندی، شہر بدری، اور وقتاً فوقتاً گھروں کی تلاشی، کبھی ولی عہدی اور دامادی کے بہانے مستقل نگرانی کی کوشش۔ امام کا حسین فخ شہید جیسے شخص کی مدح کرنا اور کبھی دعا کے انداز میں یہ کہنا کہ:

"خدا انتقام لے ان لوگوں سے جنھوں نے ہم پر ظلم کیا۔"

ان شعراء کے حق میں دعا کرنا جو ظالمین کی مذمت اور ائمہ کے حق میں اشعار پڑھا کرتے تھے۔ سخت پابندیوں کے باوجود اقامہ ماتم کی سفارش کرنا۔ سزائے موت اور ہاتھ پاؤں کاٹنے جیسی سزاؤں کے باوجود زیارتِ قبر امام حسینؑ کی طرف رغبت دلانا۔ اصحاب کو اپنے جھگڑوں کے فیصلوں کے لیے ظالم خلفا کی عدالتوں کی طرف رجوع کرنے کی ممانعت اور اپنی عدالتوں کی تشکیل کی ترغیب دینا۔ اپنے اصحابِ باوفا کا تحفظ اور ان کو ظالم خلفا کے فوجیوں کی نگاہوں سے چھپانا اور انقلابی و مبارز علویوں کے حق میں دعا کرنا۔ کیا یہ تمام باتیں اس بات کی دلیل نہیں کہ ائمہ نے کبھی بھی اپنے حق خلافت و حکومت کے حصول کے مواقع کو نظر انداز نہیں کیا۔ اور کیا یہ حرکات و اقدامات خلافت الٰہی کے قیام کے لیے کوشش نہیں۔

زیر نظر کتاب ان خطبات کی تفسیر و تشریح پر بھی مشتمل ہے جو حضرت

زینب کبریٰؑ اور حضرت امام زین العابدینؑ نے بازارِ شام و کوفہ اور اموی حکومت کے صوبائی و مرکزی درباروں میں ارشاد فرمائے۔ ان خطبات سے ظالم و بے دین حکومت کا اصل چہرہ لوگوں کے سامنے بے نقاب کر دیا۔ امام زین العابدینؑ اور آپ کی پھوپھی حضرت زینب بنت علیؑ کے خطبات ہی تھے کہ جنھوں نے بیس سال کے عوامی سکوت کو توڑا اور ان کے غیض و غضب کو انتہا تک پہنچا دیا۔ آپؑ کے خطبات نے اموی حکومت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں اور عوام الناس کو حکومت اسلامی کے صحیح حقداروں اور ان ظالم و جابر حکمرانوں کے درمیان تفاوت سے آگاہ و آشنا کیا اور یوں اہل بیتِ رسولؐ کو قیادت و امامت کے صحیح حقدار کی حیثیت سے متعارف کرایا اور ظالم امویوں کے مکروہ چہروں سے اسلامی نقاب کو نوچ ڈالا۔

امام سجادؑ نے اپنے اس کام کو صرف بازار کوفہ و شام اور دربار یزید و ابن زیاد تک ہی محدود نہ رکھا۔ بلکہ ظالم امویوں کی قید سے رہائی کے بعد بھی مسلسل اس غصب شدہ حق کے حصول کے لیے اپنی جد و جہد جاری رکھی اس سلسلے میں امام نے اپنی جد و جہد کو ان نکات پر مرکوز رکھا :

(۱) —— لوگوں میں دین کا حقیقی درک پیدا کیا۔ اس طرح لوگوں کے سامنے اسلام حقیقی کا چہرہ واضح و روشن ہوا۔ اسلام کی حقیقی تعلیمات نے لوگوں کو باطل کے مقابلہ میں حق کی پہچان کا شعور عطا کیا اور یوں قیام و جہاد ظالمین کے لیے راہ ہموار کرنے میں مدد ملی۔ اس طرح امت میں راسخ العقیدہ افراد کا ایک گروہ تشکیل پا گیا۔ افکار و تعلیمات اسلامی کو ان کے صحیح خد و خال کے ساتھ

امت کے سامنے پیش کرنے کا یہ عظیم کام امام نے اپنی دعاؤں اور مناجات کے ذریعہ کیا۔

یوں تو امام کی دعائیں اور مناجات بیش بہا معارفِ دینی کا خزانہ ہیں لیکن ان میں سے چند مطالب و مقاصد درج ذیل ہیں :

ا —— بیان تعریف و توصیف پروردگار عالم، حقیقت توحید و عظمت و قدرتِ خداوند متعال کہ جو ہر قسم کے شرک و نقص سے پاک و پاکیزہ اور منزہ و مبرا ہے۔

ب —— بندوں پر اس (خدا) کا فضل و کرم و احسان اور بندوں کا عجز و ناتوانی ان نعمات کا شکر دلوانے حق کرنے سے۔

ج —— جزا اور سزا اور جنت اور دوزخ کا بیان کہ جنت تو خدا کا اپنے نیک بندوں پر فضل و کرم ہے اور جہنم خود بندے اپنے بُرے افعال و کردار اور خدا کی نافرمانی سے کماتے ہیں۔

د —— بیانِ مکارم اخلاق کہ بندگان خدا کو چاہیئے کہ بُرے اعمالُ کردار سے پرہیز کریں اور دل و ضمیر کو ناپاک چیزوں سے آلودہ نہ کریں کہ اسی میں ان کی فلاح ہے۔

ہ —— بندوں کو اپنی حاجت روائی کے لیے صرف اور صرف پروردگار عالم کی طرف رجوع کرنے کی تلقین اور بندگانِ خدا جو کہ خود خدا کے سامنے عاجز و ناتوان ہیں کے سامنے

دستِ سوال دراز کرنے کی مذمت و ممانعت۔

و — امام ؑ نے اپنی دعاؤں میں بندگانِ خدا کے آپس کے تعلقات اور ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کی ادائگی پر خصوصی زور دیا ہے۔ امام ؑ کی نظر میں کوئی موجود و مخلوق ایسا نہیں کہ جس کے ذمہ دوسروں کے کچھ حقوق نہ ہوں۔ امام ؑ نے اپنی دعاؤں میں خصوصًا والدین کے حقوق اولاد کے حقوق، ہمسایہ کے حقوق اور اسلامی سرحدوں کے محافظ جانبازوں کے حقوق کی توضیح و تشریح فرمائی ہے اور ایک صحیح اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے ان حقوق کی ادائیگی پر زور دیا ہے۔

(۲) — مقام و منصبِ امامت و رہبریٔ امت نصِ قرآن اور احادیثِ رسول ؐ کے مطابق دراصل اہلبیت ؑ کا حق تھا۔ بعد حضرت محمد ؐ لوگوں نے ائمہ سے ان کا یہ حق چھین لیا۔ ان لوگوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس منصب کو ہمیشہ ہمیش کے لیے خاندانِ رسول ؐ سے دور رکھنے کے لیے ہزارہا جعلی احادیث رسول ؐ وضع کیں اور روایات فروش راویوں کے ذریعہ خوب خوب ان کی تشہیر کی۔ ان ہزارہا جعلی احادیث کی ترویج و تشہیر کے نتیجے میں مسلمان اہلبیت ؑ کے اصل مقام و منصب سے ناآشنا ہو چکے تھے اور قیادتِ اسلامی کا حقیقی چہرہ ان جعلی احادیث اور روایات کے نیچے

پوشیدہ ہو چکا تھا۔

امام سجاد ؑ نے منصبِ امامت پر فائز ہوتے ہی سب سے اہم کام جو کیا وہ یہ ہے کہ لوگوں کو اصل جانشین رسول ؐ کی شناخت اور پہچان کرائی۔ آپ ؑ نے کٹھن اور مشکل وقت میں بھی اس کام کو نہایت جرات کے ساتھ انجام دیا۔ آپ نے یزید کے دربار میں ائمہ اہلبیت ؑ کو حقیقی جانشین پیغمبر ؐ کے طور پر متعارف کرایا اور اموی خاندان کے اصل چہرہ سے نقاب کشائی کی۔

(۳) — دوستدارانِ اہلبیت ؑ اور شیعانِ علی ؑ جو کہ واقعہ کربلا کے بعد پراگندہ اور منتشر و متفرق ہو چکے تھے ان کو نئے سرے سے مربوط و منظم کیا اور ان افراد کو معارفِ اسلامی کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ آپس میں گہرے ربط و ضبط کی دعوت دی۔ اس طرح شیعوں کو ایک منظم گروہ میں ترتیب دینے کا کام بھی انجام دیا۔

خداوندِ عالم ہمیں ائمہ معصومین ؑ کی سیرت کو سمجھنے کی توفیق دے اور اس سیرت و کردار کے مطابق اپنے دینی و دنیاوی معاملات کو ترتیب دینے کا شعور عطا فرمائے۔ آمین

سید علی شرف الدین موسوی

باسمہٖ سبحانہٗ

عاشورِ محرم
اور
امام زین العابدین علیہ السلام

یہ کربلا اور یہ لق و دق صحرا،
یہ کربلا اور یہ تپتا ہوا آسمان،
یہ کربلا اور یہ جلتا ہوا سورج،

ساری فضا خون آلود ہے، لبِ فرات پرخروش ہے۔ زمین لرز رہی ہے۔

ہنہناتے ہوئے گھوڑے رواں دواں ہیں۔ شمشیر بکف سوار ہر طرف سرگرداں ہیں۔ یقیناً کوئی عظیم واقعہ رونما ہونے والا ہے کہ جس کے احساس سے زمین و آسماں کانپ رہے ہیں۔ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے —— یہ ایک جنگ ہے۔ آزادی اور غلامی کی جنگ۔ شہامت اور شقاوت کی جنگ۔ حق و صداقت کی فوج ہمیشہ کی طرح قلیل اور تعداد میں کم۔ باطل کا لشکر حسبِ سابق کثیر اور بے حد و حساب۔ جنگ چھڑتے ہی ہر حملے میں سپاہِ حق کی تعداد میں مزید کمی ہوتی جا رہی ہے۔ یعنی اِدھر کا جب کوئی سپاہی اپنے خون میں نہا کر زمین پر گرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ شجرِ انسانیت کی ایک شاخ ٹوٹ کر زمین

پر آ گری۔

اب دن کی آخری ساعتیں ہیں، یہ آگ اُگلتا ہوا سورج، یہ تپتا ہوا آسمان، یہ لرزتی ہوئی زمین، یہ خون آلود فضائیں، یہ شور کرتی ہوئی فرات کی موجیں، سب کی سب باہم ٹکرا کر پاش پاش ہوا چاہتی ہیں۔

کیونکہ شجرِ انسانیت کی تمام شاخیں ایک ایک کرکے گر چکی ہیں۔ بس اب تنہ اور تنِ تنہا تنہ باقی رہ گیا ہے جو بہیمیت کے تناور ترین درختوں کے مقابل پوری ثابت قدمی کے ساتھ کھڑا ہے اور اب وہ بھی خشک ہو کر گرا چاہتا ہے۔

یہ ایک پاک ترین انسان ہے اور شجاعت و مردانگی کا عظیم ترین پیکر ہے جو تنِ تنہا میدانِ جنگ میں کھڑا ہے۔

امام حسین علیہ السلام جو تمام خوبیوں کے کامل مجسمہ ہیں اور جن میں زندگی کے تمام گرانقدر محاسن مثلاً حریت، عدالت، شجاعت اور حقانیت و صداقت سبھی جمع ہیں۔ اب وہ وقت آپہنچا کہ دین کا یہ پُرافتخار سرمایہ بھی شہید ہو جائے۔

اگر ایسا ہوا تو خطرہ ہے کہ وہ تمام محاسنِ زندگی جو انھیں اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں کہیں مٹ نہ جائیں۔ آپؑ نہیں چاہتے کہ ایسا ہو۔ درحقیقت یہی آرزو آپؑ کی شہادت کا سبب بنی ہوئی ہے۔

اسی کے لیے آپؑ نے صدائے استغاثہ بلند فرمائی اور نصرت طلب کی۔ مگر یہ نصرت طلبی اس لیے نہ تھی کہ کوئی آ کر ہماری جان بچائے بلکہ اس لیے تھی کہ کوئی آ کر شیطان صفت انسانوں اور قابلِ نفرت لوگوں کے چنگل سے انسانیت کو رہائی دلائے۔

اور آپؑ کا یہ استغاثہ بے سود اور بے جواب بھی نہیں رہا۔ کیونکہ اس وقت

آپؑ ہی جیسی مثالی شخصیت ایک اور بھی موجود تھی جو آخری لمحوں میں (گلے میں رسّی بندھوا کر) دُنیا کو یہ دکھا دے گی کہ دیکھو انسانیت کا گلا یوں گھونٹا جا رہا ہے۔

اور وہ ہستی بالکل آپ ہی کے نمونہ کی آپؑ کے فرزند کی ہے۔ بیٹا چاہتا ہے کہ دوڑ کر باپ کی مدد کے لیے میدان میں پہنچے اور دکھا دے کہ انسانیت کے چاہنے والے اور حق کے طرفدار اب بھی موجود ہیں، چاہتا ہے کہ اُٹھے، میدانِ جنگ میں قدم رکھے اور اپنی جان دیدے مگر بخار نے اُٹھنے نہ دیا۔ طاقت نے جواب دے دیا۔ یہ بخار بھی خدا کی ایک مصلحت تھی کہ جس نے اس کو میدانِ جنگ میں پہنچ کر شہید ہونے نہ دیا۔

کیونکہ اس جیسے پیشوا نے خلق کو تو ابھی ایک ناپسندیدہ ہجوم اور ناہنجار انبوہ کے مقابل تنہا اور بالکل تنہا رہنا ہے۔

الغرض قریب تھا کہ یہ جو چاہ رہے تھے کر گزرتے، یعنی اپنی قابلِ فخر شجاعت و بہادری کا مظاہرہ کرتے حق و انسانیت کی طرف سے ثابت قدمی دکھاتے، اپنے خون میں نہاتے اور آج ہی کربلا کے میدان میں یہ بھی جان دے دیتے۔

مگر تقدیر اور مشیّتِ الٰہی کے ہاتھوں امام زین العابدین سید الساجدین علیہ السلام زندہ بچ گئے اور ان کو زندہ بچ بھی جانا چاہیئے تھا۔

اس لیے کہ اگر آج یہ بھی شہید ہو جاتے تو پھر کون تھا جو لوگوں کے کانوں تک شہیدِ دشتِ کربلا کے خونِ ناحق کی آواز پہنچاتا۔ کون تھا جو پیغامِ عاشورا کو صفحۂ تاریخ پر رقم کراتا۔ کون تھا جو فرزندِ زہرا سلام اللہ علیہا کی حق طلبی اور حریت طلبی کو عالمِ انسانیت کے دل و دماغ میں بٹھاتا۔

واقعاً اگر یہ زندہ نہ رہتے تو بڑی مصیبت پیش آتی۔ بھلا ان کے سوا کوئی اور تھا جو اس ثابت قدمی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتا۔ کوئی اور تھا جو انسانیت کے مستقبل پر ترس کھاتا۔ کوئی اور تھا جو پیغامِ عاشورا کو آگے بڑھاتا۔

واقعاً کوئی نہ تھا، تنہا یہی تھے اور ان ہی کو ہونا بھی چاہیئے تھا کہ پوری جرأت اور دلیری کے ساتھ رہبرانہ انداز سے ظلم کے خلاف فریاد کریں۔

جنگِ قادسیہ

عدو شود سببِ خیر

اب ایک فوج اور دیکھیے جس کے پاس نہ کوئی اسلحہ ہے، نہ کوئی سازوسامانِ جنگ۔ بالکل سادگی کے ساتھ مگر ایمان کے اسلحوں سے مزین، ایک عیش و عشرت میں ڈوبی ہوئی فوج سے جنگ کے لیے چلی ہے تاکہ زحمت کش عوام کو شاہی پر فتح دلائے۔

میدانِ جنگ نے معرکہ آرائیوں کے بے شمار مناظر دیکھے ہیں جن میں کہیں کامیابی نظر آتی ہے کہیں ناکامی مگر میدانِ جنگ کے حافظے میں ایسا معرکہ کوئی نہیں جس میں فتح یاب اور کامیاب وہ لوگ ہوں جو پابرہنہ ہوں اور جن کے پاس سوائے تلوار کے اور کوئی اسلحہ نہ ہو۔

اس لیے کہ اسبابِ فتحمندی تو یہ ہیں کہ گاڑیوں اور چھکڑوں پر بہت سی تلواریں لدی ہوں، ابھری ہوئی رانوں اور پتلی پتلی ٹانگوں والے گھوڑے ہوں، بلند قامت، چوڑے چکلے سینے اور گٹھے ہوئے بازوؤں والے مسلح افسرانِ فوج ہوں جن کے سروں پر آہنی خود ہوں، بر میں زرہیں ہوں، رنگین اور دیدہ زیب

پرچم ہوں، گزشتہ فتحیابیوں کے پائے ہوئے دلکش تمغے ہوں، جنگ آزمودہ اور تجربہ کار سپاہی ہوں اور ساتھ ہی ساتھ فوجی ترانے ہوں جن میں پچھلی فتحمندیوں کے حوالے ہوں۔

مگر اس مرتبہ تو میدانِ جنگ نے معرکہ آرائی کا ایک دوسرا ہی نقشہ دیکھا کہ یہاں فتحیابی کا معیار نہ تجربہ کاری ہے اور نہ سامانِ جنگ کی فراوانی بلکہ اس مرتبہ تو کفر کے مدمقابل ایمان آیا ہے۔

یہ ایک اسلامی فوج ہے جس کے پاس نہ گاڑی ہے نہ چھکڑا، نہ تو اسلحہ ہے اور نہ ہی کوئی اور سامانِ جنگ۔ چند دبلے پتلے سوار، چند سپاہی جن کے بازو نازک اور پتلے، گال پچکے ہوئے اور ان کے ساتھ سیدھے سادے پرچم، نہ زیب نہ زینت، پھر انھیں جنگ کا کوئی زیادہ تجربہ بھی نہیں ایک سیدھے سادے طریقے سے آئے ہیں مگر ان کے دل اس مقصد سے بھرے ہوئے ہیں کہ ہم انقلاب لائیں گے۔

ایسا بڑا انقلاب جو ناقابلِ فراموش ہو، ایسا انقلاب جو تقدیر بدل دے یہ ایسی جنگ نہیں جو کسبِ منفعت اور حصولِ مالِ غنیمت کے لیے ہوا کرتی ہے اور از راہِ انسانیت اس کا فریقین پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا، اس میں محض طاقت کا اتلاف ہے اور مقاصدِ سرمایہ داری اور شہنشاہی کے حصول کے سوا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

انقلاب اس وقت بڑا سمجھا جاتا ہے جب وہ کوئی انسانی نصب العین اور بامقصد طرزِ فکر لے کر اٹھے، اگر ایسا ہوگا تو اس کو کسی سرحد کی طرف رخ کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ اسے اس سازوسامان کی حاجت ہوگی جو سالفہ طاقتیں اپنے دفاع کے لیے فراہم کرتی رہی ہیں۔

اس فوج کے پاس اگرچہ کوئی ظاہری ساز وسامان نہیں پھر بھی وہ انسانیت کے نظریہ (آئیڈیالوجی) سے پوری طرح آراستہ ہے۔ یعنی جو کچھ سابقہ نظاموں میں نہ تھا وہ آرہا ہے تاکہ سامنے رکھا جائے۔

میدانِ جنگ شاید دل ہی دل میں ہنس رہا ہو کہ یہ فوج کس برتے پر چاہتی ہے کہ ایران اور ایرانی فوجوں پر فتح حاصل کرے۔ مگر اسے یہ پتہ نہیں کہ حجاز سے جو فوج چلی ہے وہ جنگ کے لیے نہیں بلکہ زندگی بخشنے چلی ہے۔ یہاں مسئلہ جنگ اور فتح کا نہیں بلکہ مسئلہ صلح و آشتی ہے۔ مسئلہ کسی کو برباد اور بے سروسامان کرنے کا نہیں بلکہ آباد کرنے اور انھیں مزید سامان دینے کا ہے۔ بظاہر جنگ بھی ہے اور نعرہ جنگ بھی مگر اس کی بنیاد میں ایمان ہے اور برائیوں سے نجات دلانا ہے۔ اس لیے اس مقصد کو تو کامیاب اور فتحیاب ہونا ہی تھا، کیونکہ اس میں عمل پیش پیش ہے اور ایمان اور عمل مل کر کسی آئیڈیالوجی کی کامیابی کے بنیادی سبب ہیں۔

بالآخر اللہ پر ایمان رکھنے والی فوج آگے بڑھی تاکہ انسان کو طبقاتی الجھنوں سے نجات دلائے اور اس کے ہر طرح کے استحصال کو ختم کردے۔

ایران کی ظاہری اسلحوں سے آراستہ فوج، اس ایمانی اور سلاحِ باطنی سے آراستہ فوج کا مقابلہ نہ کرسکی اس کے قلعہ کا حصار ٹوٹ گیا اور اس کے ٹوٹتے ہی شاہی محلات اور برج سب منہدم ہوگئے۔

لیجیے قادسیہ کا قصہ تمام ہوا۔ وہ لوگ جو عمل کے ساتھ ایمان رکھتے تھے وہ ان لوگوں پر غالب آئے جو عمل کے ساتھ ایمان نہیں رکھتے تھے۔ یزدجرد سوم نے فرار اختیار کیا اور میدان چھوڑ کر بھاگا۔ اس کی شاہی کا خاتمہ پورے نظامِ ظلم و استبداد کا خاتمہ اور عوام کی فلاح و بہبود کا آغاز تھا۔

یزدجرد کی شکست اور شاہی خاندان کی گرفتاری

یزدجرد کی شکست نے یہ ثابت کردیا کہ مساواتِ انسانی کے مقابلہ میں ایک فاسد اور بے اعتقاد قوم نے شکست کھائی اور اب یہ قوم اس کی مستحق ہے کہ اسے قید واسیر کیا جائے تاکہ وہ اپنے کرتوتوں کی سزا پائیں۔

اور یزدجرد کا خاندان چونکہ ظلم و استبداد و خود پرستی کا اعلیٰ نمونہ تھا اس لیے اس کو سزا، ظلم و استبداد کے پورے نظام کو سزا اور اس کی تنگدستی خود پسندی کے تمام طبقات کی تنگدستی تھی۔

اس لیے گرفتاریاں سب سے پہلے شاہی خاندان سے شروع ہوئیں تاکہ وہ اپنے جرم کفر کا کفارہ ادا کریں۔

اسیروں کے سفر کا آغاز تیسفون (مدائن) سے ہوا اور ہوسکتا ہے کہ ان میں چند بے گناہ بھی ہوں۔

اگرچہ کسی معاشرہ میں رہتے ہوئے انسان اس کی آلودگیوں سے بہت کم مستثنیٰ ہوتے ہیں اس لیے کہ کچھ گناہ معاشرہ کا رسم و رواج بن جاتے ہیں اور انسان خواہ اسے چاہے یا نہ چاہے، اُسے محسوس کرے یا نہ کرے، اس میں آلودہ ہوکر ہی رہتا ہے۔ مگر جب اصلاح شروع ہوتی ہے اور ان تمام مذموم رسم و رواج کی بیخ کنی ہونے لگتی ہے تو تمام لوگوں کو اپنا وہ پُرانا رنگ چھوڑنا پڑتا ہے اور یہ نیا رنگ اختیار کرنا پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس تبدیلی میں بڑی زحمت اور بے حد کوشش کرنی پڑتی ہے۔ خاصکر جبکہ یہ نیا رنگ اس پرانے رنگ سے بالکل جدا اور متضاد ہو۔

قاعدہ ہے کہ جب کسی معاشرہ کی تطہیر مقصود ہوتی ہے تو سب سے پہلے اس کی سربرآوردہ اور معروف ترین ہستیوں میں سے بھی ان کو منتخب کیا جاتا ہے جو ان میں سب سے زیادہ ذی وجہ معروف اور سب سے زیادہ بااثر سمجھے جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اسیروں کے اس گروہ میں ایسی ہستیاں ایران کی شہزادیاں یعنی دختران یزدجرد ہی ہیں۔

شاہِ زنان کہ جو خود بھی معروف اور اس کا کنبہ بھی معروف[1] وہ خود بتاتی ہے کہ قوم کے مختلف طبقات کے اعمال سے اس کو کوئی ربط نہیں مگر چونکہ وہ اپنے خاندان میں ممتاز اور کنبہ میں سب سے برتر ہے اس لیے اسیروں کے ساتھ وہ بھی جا رہی ہے تاکہ اس کو ایک نئی تقدیر ہاتھ آئے اور پھر اسی ترتیب سے پورا معاشرہ بدل جائے۔ لوگ اپنے سربراہ کو دیکھ کر برائیاں ترک کریں اور خوبیاں اختیار کریں اور واقعاً کسی قوم کی اصلاح کا یہ بہترین طریقہ ہے۔

اسیروں کا یہ قافلہ تیسفون (مدائن) سے روانہ ہو کر ایسے مقام کی طرف جا رہا ہے جس کا نام مدینہ ہے۔ اور اب یہ سب مدینہ کے قریب پہنچے ہیں۔ ان اسیروں میں سب سے زیادہ نمایاں دخترانِ یزدجرد ہیں مگر یہ شاہی خاندان میں پلی لڑکیاں بھی عام قیدیوں کے ساتھ بالکل سادے لباس میں، سیدھے سادے غیر مزین کجاووں میں بیٹھی ہوئی اور غیر مرصع اور معمولی سواریوں پر سوار اپنے ایک نامعلوم مقدر کی طرف جا رہی ہیں۔

اگرچہ ان کے اردگرد ان کی حفاظت کے لیے فوج بھی ہے اور خواتین کے احترام اور ان کی فطری نازک طبعی کے پیشِ نظر ان کے پاسِ خاطر کا بھی پورا

---

[1] اہلِ تاریخ نے ان معظمہ کا نام شہربانو، سلافہ، غزالہ اور سلامہ وغیرہ بھی تحریر کیا ہے۔

پورا لحاظ رکھا جا رہا ہے مگر سوچنے کی بات ہے کہ ان شہزادیوں کے دلوں پر کیا گزر رہی ہوگی جو عالیشان محلوں میں رہتی تھیں اور زندگی کی تمام سختیوں سے ہمیشہ دُور تھیں۔ انھوں نے اپنے حکم اور اس کی اطاعت کے سوا اب تک کچھ بھی نہ دیکھا تھا۔

غور کیجیے۔ وہ شہزادیاں جو آج تک حریر و خز کے سوا اور کسی بستر پر نہ سوئی ہوں، حریر و خز کے سوا کوئی اور لباس نہ پہنا ہو، سوائے فرشِ زمردین کے کبھی زمین پر قدم نہ رکھا ہو، شہزادوں کے سوا کسی اور سے ہمکلام نہ ہوئی ہوں، عالیشان محلوں کے سوا کسی اور مکان میں نہ رہی ہوں، رنگین دسترخوانوں کے سوا کہیں اور بیٹھ کر کھانا نہ کھایا ہو، آبنوس و طلا سے بنی ہوئی گاڑیوں کے سوا کسی اور سواری پر سوار نہ ہوئی ہوں، آج وہ اپنے عالیشان محلوں سے دور ان مردوں کی قید میں ہیں جن کے ہاتھوں میں تلواروں کے سوا کچھ نہیں اور جن کی زبانوں پر سوائے لا الہ الا اللہ اور کوئی دوسرا لفظ نہیں۔

واقعاً ان بیچاریوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ وہ حوادثِ روزگار اور بہاؤ سے بے خبر! انھیں نہیں معلوم کہ آئندہ ان کی تقدیر میں کیا ہے۔ وہ مدینہ سے قطعاً ناواقف، ان کی منزل ایک بے آب و گیاہ سرزمین ہے۔ ہر لحظہ اُٹھتے ہوئے ریت کے طوفانوں کے پیچھے انھیں اپنی موت گھات لگائے بیٹھی نظر آتی ہے۔ ایسا ملک کہ جس کی آبادیوں میں نہ کوئی برج نہ کوئی قلعہ اور کوئی شاندار قصر تو ڈھونڈے سے بھی نہ مل سکے، اس پر مزید یہ کہ اپنا مستقبل اندھیرے میں بالکل مبہم۔ انھیں نہیں معلوم کہ ان کے ساتھ کیا برتاؤ ہوگا۔

تیسفون (مدائن) کے عالیشان قصروں کے اندر چھپی ہوئی تاریخ کی

یاد یقیناً ان کے مغموم دلوں کو ستا رہی ہوگی۔ انھیں اپنی تقدیر میں تو موت، ایذا اور موت سے بھی بدتر ذلّت و رسوائی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ کاش! ایسی حالت میں اگر رہائی مل جاتی تو یہ احترامِ انسانیت کا بڑا کارنامہ ہوتا جیسا کہ سیاسی یا انتظامی مقصد کے لیے یہ عموماً ہوا کرتا ہے۔

اور سب سے بڑا افسوس تو اس امر کا ہے کہ یہ ذلّت ان لوگوں نے دی جو شاہانہ آداب نہیں جانتے، یہ ٹھوکر ان لوگوں نے لگائی جن کے پاؤں میں شاہانہ پاپوش تک نہیں۔ بہرحال ان شہزادیوں کے دلوں پر اس وقت کیا گزر رہی تھی وہ تاریخ کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔

لیکن یہ نتیجہ تو نکالا ہی جا سکتا ہے کہ اگر محافظینِ قافلے کے عادلانہ رویّہ کو دیکھ کر ان کے دلوں میں امید کی کوئی کرن پیدا بھی ہوئی ہوگی تو اس امر سے تو بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اپنا مستقبل نامعلوم ہونے کی وجہ سے وہ مضطرب اور بے چین ضرور رہی ہوں گی اور اسی کیفیت کے ساتھ وہ واردِ مدینہ ہوتی ہیں۔

مدینہ مرکزِ اسلام ہے۔

مدینہ ایک نقطہ ہے بالکل تیسفون (مدائن) کے مقابلہ کا۔

تیسفون (مدائن) مختلف طبقاتِ انسانی کا شہر، غلامی کا شہر، ظلم و ستم کا شہر، بے مقصد کرّ و فر کا شہر۔

تیسفون (مدائن) نقش و نگار کی ایک دنیا ہے جو دلفریب ہے، دلکش ہے، آزاد انسانوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے پھر انھیں اپنے معاشرہ کے تار و پود میں شامل کر کے حسبِ رسم و رواج ان کا استحصال کرتا ہے۔ ان میں غلامانہ ذہنیت پیدا کرتا ہے۔ اظہارِ بندگی اور خوشامد کو ان کی فطرت

میں داخل کرتا ہے۔

لیکن مدینہ۔ اسلام کا ایک قلعہ ہے۔ ایسا شہر ہے جس میں مختلف طبقے نہیں، ایسا شہر ہے جس میں کوئی فریب نہیں، ایسا شہر ہے جس میں کوئی ظلم و ستم نہیں، ایسا شہر ہے جس میں کوئی غلامی نہیں، ایسا شہر ہے کہ اگر اس میں مسلح بہادروں کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے تو محض انسانیت کی خدمت کے لیے۔ یہاں پہنچ کر انسان روحانی اور جسمانی دونوں طرح کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے، یہاں ایک نئی فضا پاتا ہے، اس میں ایک نیا درک پیدا ہوتا ہے اور وہ زندگی کے صحیح اور واقعی مفہوم سے آشنا ہو جاتا ہے۔

مدائن کے قیدی مدینہ میں

اب مدائن کے بسنے والے اسیر و قیدی ایک آزاد مدینہ میں داخل ہوتے ہیں تاکہ اپنی دارالحکومت کی غلامانہ و محکومانہ زندگی کو اسلامی دارالحکومت کی آزاد زندگی سے تبدیل کرلیں۔

یہاں مناسب یہ سمجھا گیا کہ ان اسیروں کو فروخت کر دیا جائے تاکہ یہ اپنے بسنے بسانے کے لیے ایک گھر پائیں چنانچہ ان کی فروخت شروع ہو گئی، مگر دخترانِ یزدجرد بالکل الگ کھڑی ہوئی ہیں۔ بھلا کس میں اتنی استطاعت ہے جو ان کی قیمت ادا کر سکے۔ حضرت عمرؓ حیران ہیں کہ کیا کریں۔ انھیں ضرورت محسوس ہوگی کہ اس امر میں کسی سے مشورہ اور رہنمائی حاصل کریں اور ان کی نظریں

ا۔ دیگر روایات کے مطابق دخترانِ یزدجرد، حضرت عثمانؓ کے دورِ حکومت میں یا حضرت علیؑ کے زمانۂ خلافت میں مدینہ لائی گئیں۔

مشورہ اور رہنمائی کے لیے وہاں حضرت علیؑ امیرالمومنین سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے۔ وہ عالمِ بشریت کے لیے خانۂ کعبہ کا دیا ہوا ایک تحفہ ہیں اور درسگاہِ پیغمبرؐ کے حقیقی تربیت یافتہ ایک فرد ہیں۔ آپ نے ان سے مشورہ کیا اس لیے کہ ان اسیروں پر اگرچہ انھیں تسلّط حاصل ہے مگر یہ تسلّط انھیں اپنے ذاتی اقتدار یا اپنی خواہش و مرضی سے نہیں ہے بلکہ یہ تسلّط اسلام کے دیے ہوئے قانون کی رو سے ہے، لہٰذا وہی مشورہ دے جس کو اسلامی قوانین پر پورا عبور ہو۔

امیرالمومنینؑ کا حکومتِ وقت کو مشورہ

شہزادیاں فروخت نہیں کی جاتیں

یہ درست ہے کہ اسلام ایک درسِ مساوات و اخوت ہے، ایک درسِ عدل و صدق ہے۔ اس کی نظر میں رنگ و نسل، ذات پات اور طبقات کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کے نزدیک کسی خاص خانوادہ یا خاص مقام سے تعلق رکھنا انسان کی قدر و قیمت کو عمومی حد سے نہیں بڑھاتا۔ مگر یہ بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اسلام اپنے اندر مہر و محبت کی روح اور خلوص و مروّت کی ایک دنیا رکھتا ہے۔ اسلام مساوات کو اخلاق و محبت کا ہمکنار بناتا ہے اور اخلاق و مروّت کو ایک پرشکوہ بلندی پر پہنچانے کا خواہشمند ہے۔

حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ نے صورتِ حال دریافت کی۔ آپؑ کی ذات سرچشمۂ عدالت ہے بلکہ عینِ عدالت ہے۔ آپؑ اسلام کی صحیح روح اور اس کے اصلی مقاصد سے پوری طرح آگاہ ہیں، آپؑ اسلام کے رموز و نکات سے خوب واقف ہیں، آپؑ جانتے ہیں کہ اگر اسلام کبھی کسی زمانہ

میں مخصوص شرائط کے ساتھ معاشرہ کی اصلاح کے لیے اسیری کی اجازت دیتا ہے تو یہ اور بات ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کبھی بھی اس ذلتِ اسیری کو برداشت نہیں کر سکتی۔ آپؑ یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر اسلامی قانون کو برمحل اور صحیح طور پر نافذ کیا جائے تو وہ کس قدر زیادہ پُراثر ہوگا۔ اس لیے آپؑ نے سب سے پہلے تو یہ چاہا کہ اُن کے چہرے سے احساسِ ذلت کے اثرات کو دُور کر دیں ـــــ آپؑ نے حضرت عمرؓ کو خطاب کر کے فرمایا: شہزادیاں فروخت نہیں ہوا کرتیں۔ ان کا وقار اس طرح کے سلوک سے بالاتر ہے۔ یہ کہہ کر آپؑ نے ان شہزادیوں کی قدر و منزلت کو عام کنیزوں سے بڑھایا اور انھوں نے محسوس کیا کہ اسلام نے اسیری کے باوجود ہمارے وقار کا لحاظ رکھا۔

اس کے بعد آپؑ نے ایک دوسرا مشورہ دیا اور یہ مشورہ بھی آپؑ کی حریت پسندی اور اعلیٰ روحانیت کی نادر مثال ہے، آپؑ نے فرمایا:

ان شہزادیوں کو فروخت کرنے کے بجائے ان کو آزاد کر دیا جائے اور انھیں اختیار دیا جائے کہ وہ مسلمانوں کے مجمع میں سے جس کو چاہیں اپنا شوہر بنانے کے لیے منتخب کر لیں۔ اور ان کی قیمت بیت المال سے ادا کر دی جائے۔

سارا مجمع آپ کے اس فیصلہ کو سُن کر اور اس بلند نظری اور انسانی سلوک و رواداری کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

اب ان شہزادیوں کو آزاد کر دیا گیا اور انھیں اجازت دیدی گئی کہ وہ اس مجمع سے اپنی اپنی پسند کا کوئی مرد منتخب کریں جس سے ان کا عقد کر دیا جائے۔

حضرت شہربانو کا عقد امام حسینؑ سے

جس وقت یزدجرد کی شہزادیوں کو اپنے لیے شوہر کے انتخاب کا اختیار

ملا توان کے سامنے اسلام کی پرشکوہ اور مہربان دنیا کا دروازہ کھل گیا اور حریت پرور مدینہ کا چہرہ کھل کر سامنے آگیا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ اسلام نے ایک اسیر و قیدی کا مقام اتنا بلند کیا کہ اسے اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی دیدی گئی۔

الغرض اب وہ وقت آگیا کہ دختران یزدجرد اپنے لیے شوہر کا انتخاب کرلیں اور خود اپنے لیے ایک خاندان اور کنبہ تعمیر کریں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ان شہزادیوں میں سب سے زیادہ تیز نظر کون ہے جو اپنے لیے بہتر سے بہتر شوہر کا انتخاب کرے۔ اور از روئے انسانیت و شرافت اگر دیکھا جائے تو یہ ان اسیروں کو ایک بہترین موقع دیا گیا ہے کہ وہ اپنی قسمت کا فیصلہ خود کریں۔ اس لیے انھیں یہ چاہیئے کہ اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔

مجمع میں اس وقت عالمِ اسلام کے ایک سے ایک گراں قدر، بلند منزلت اور صاحبِ تقویٰ مرد بیٹھے ہوئے ہیں اور ان ہی میں مولائے متقیان کے فرزند حضرت امام حسینؑ بھی تشریف فرما ہیں جو ان میں ممتاز اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ حضرت شہربانو نے ایک نظر سارے مجمع پر ڈالی اور یہ ان کی خوبیٔ قسمت تھی کہ یہ انسانیت و حقانیت کا پیشوا اس وقت وہاں موجود تھا۔ آپ نے ان کو منتخب کیا۔ یہ وہ صاحبِ شرف ہستی ہے جو اکثر زانوئے رسولؐ پر بیٹھی ہے، سجدے میں رسولؐ کے گلے میں باہیں ڈالی ہیں، بہترین زنانِ عالم کی آغوش میں پرورش پائی ہے اور سرورِ آزادگان امیرِ مومنان کے مکتبِ عدالت میں تربیت پائی ہے۔ حضرت شہربانو کا یہ انتخاب ہی بتلاتا ہے کہ آپ ایک صاحبِ نظر، ہوشمند اور خرد و ادراک سے حد درجہ بہرہ یاب تھیں۔ آپ ایک ایسے جوان کو منتخب فرماتی ہیں جس کو آپ نے ایک نظر ابھی ابھی دیکھا ہے۔ اس سے پہلے

آپ نہ اس کے روشن خاندان کو جانتی تھیں نہ اس کے معیارِ تقویٰ اور بلندیٔ کردار سے واقف تھیں۔ انھوں نے صرف ایک نظر ان کا چہرہ دیکھا اور ہر چیز کا اندازہ کرلیا اور سچ ہے، باریک بین اور دور رس نگاہیں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔

اب یہ ایران کی شہزادی کنیزی سے آزاد ہو کر امیر المومنینؑ کے اس فرزندِ عالیقدر کی زوجیت اور عقدِ نکاح میں آئیں اور اس طرح یہ حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کی بہو بلکہ اسلام اور بانیٔ اسلام کی بہو بن گئیں۔ اور یہ تاریخِ ایران میں شاہی خاندان کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

یہ شہزادی جو راستہ میں یہ سوچ رہی تھیں کہ دیکھیں کون سا مستقبلِ مبہم ان کا انتظار کر رہا ہے۔ آج انھیں اپنی قوتِ ادراک اور حسنِ انتخاب کی بنا پر وہ مستقبل مبہم ہاتھ آگیا۔ اب وہ اپنے اس گزشتہ دور کی شاہانہ زندگی سے بھی زیادہ آزاد تھیں جس کی یاد انھیں اب تک ستا رہی تھی۔

زمانہ آگے بڑھا۔ خلیفۂ سوم کی حکومت کے خاتمہ کے بعد زمانہ پرآشوب ہوگیا۔ حضرت علیؑ جو اب تک مسلسل خاموش رہے اب کب تک خاموش رہتے، کب تک دم بخود رہتے اور کہاں تک ضبط سے کام لیتے۔ حق و عدالت کی متلاشی دنیا بار بار آپؑ کے آستانے پر آ رہی تھی۔ لوگوں کے اصرار پر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور اگرچہ غیر مستحق اور نااہل لوگ پہلے کی طرح اب بھی جاہ و منصب کی جستجو میں لگے رہے اور ماضی کے لوگ تو کامیاب بھی ہو چکے مگر اس میں حیرانی اور پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ سچ ہے اگر جور و ستم، حق کشی اور ناروا پسندی کا چہرہ سامنے نہ ہو تو حق پسند اور زیبا طلبی کی قدر و منزلت لوگوں کو کیا ہوگی۔ اگر ظلم سامنے نہ ہو تو عدل و انصاف کیسے نظر آئے گا۔

امام کی زندگی کا پہلا حصّہ

عہدِ امیر المومنین علیہ السلام اور ولادتِ امام سجادؑ

امیر المومنین علیہ السلام مجسمۂ عدالت ہیں اور اس حیثیت سے آپؑ مسلمانوں کے پہلے اور واقعی پہلے رہنما ہیں اور اسلام کی حقیقی امامت و قیادت پر فائز ہیں اگر دنیا آپؑ کی راہ میں رکاوٹیں نہ کھڑی کرے تو آپؑ حق و راستی کی جڑیں سارے معاشرے میں پھیلا دیں گے اور اسلامی نظام کو کامیابی سے ہمکنار کردیں گے اور امیر المومنینؑ کی کامیابی درحقیقت قسط و عدل، حق و حقانیت، شرافت و انسانیت کی کامیابی ہوگی۔ بہرحال امیر المومنینؑ کا دور بھی گزرتا رہا اور اسی دور میں سچائی اور صداقت کی دنیا کو ایک تحفہ ملا۔ اور وہ یہ کہ خاندانِ محمدیؐ میں حضرت شہر بانو کے بطن سے ایک بچہ اپنے ساتھ نیکیوں

کی ایک دنیا لیے ہوئے پیدا ہوا[1] اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی ولادت صبر و ضبط، تحمل و برداشت، جرأت و ہمت کی دنیا کے لیے ایک عظیم تحفہ ہے۔

اس نومولود کا نام علیؑ رکھا گیا۔ یہ نام اگرچہ باپ کی نگاہوں میں بڑا، بڑا عظیم بلکہ اسمِ اعظم تھا لیکن ماں کی نگاہوں میں بھی کچھ کم پیارا نہ تھا۔ بھلا وہ اس مردِ حریت کو کیسے فراموش کرسکتی تھیں جس نے ان کو قید سے آزاد کرا کے دخترِ پیغمبرِ اسلامؐ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی بہو بنا دیا ہو۔

مگر افسوس، قدرت کے کرشمے بھی عجیب ہیں۔ قسمت میں تو یہ تھا کہ یہ نوجوان دوشیزہ لباسِ عروسی صرف اس لیے پہنے کہ صرف ایک بچے کو جنم دے اور وہ خود پھر اس دنیا میں نہ رہے۔

حضرت شہر بانو نے زمانۂ نفاس ہی میں وفات[2] پائی۔ دنیائے اسلام میں فقط چند دن رہیں اور اپنی زندگی کے یہ لمحات خوش قسمتی کے ساتھ گزار گئیں اور آنکھ بند ہوتے ہوئے بھی جگر گوشۂ زہراؑ کو ایک ایسے بچے کا باپ بنا گئیں جو آپؑ کے بعد دو عالم کی قیادت سنبھالے۔ آپ دنیا سے گئیں مگر صبر و ضبط کی دنیا کو ایک عظیم تحفہ دے گئیں۔

اب یہ نومولود اگرچہ ماں کی آغوش سے محروم ہے مگر اسے باپ دادا، چچا اور پھوپھیوں کی پوری پوری شفقت حاصل ہے۔ یہ ایسے ماحول میں پرورش پا رہا ہے جس میں ہر طرف اللہ کا نام لیا جاتا ہے گھر کا دروازہ

---

[1] ۱۵ جمادی الاوّل سنہ ۳۶ھ لیکن بعض مورخین نے آپؑ کی ولادت کو سنہ ۳۸ھ کے کسی اور ماہ میں بھی تحریر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ناسخ التواریخ، جلد ۱، حضرت سجادؑ صفحہ ۱۰

[2] آپ کے زمانۂ وفات کے متعلق ایک دوسری روایت بھی ہے۔

مسجد ہی میں ہے، اس لیے اگر کبھی گھر سے نکلا تو مسجد میں پہنچا اور وہاں بھی ہر طرف کلامِ پاک کی تلاوت کی آوازیں سُنائی دے رہی ہیں لہٰذا بچپن سے سنتے سنتے یہی کلامِ پاک اس کا دستورِ حیات بن گیا۔

عہدِ امام حسن علیہ السلام

اس اثنا میں اسلام کے امامِ دومؑ اور رسولِ خاتمؐ کے بڑے نواسے کی صلح نے جو ظالم و غاصب حکومت کے رسوا کرنے کے لیے ایک پُراز حکمت و مصلحت اقدام تھا مسلمانوں میں علمی فقہی اور تمدنی افکار کے پروان چڑھنے کے لیے ایک اچھی فضا پیدا کر دی اور آلِ محمدؐ کو موقع ملا کہ وہ حقائقِ دینی و فقہی کو زندہ رکھنے کی کوشش کریں اور اسے لوگوں تک پہنچائیں۔ اس وقت مسجدِ رسولؐ راویانِ حدیث اور اہلِ خبر سے بھری رہتی تھی اور حضرت شہر بانو کے فرزند اس مقدس جگہ کبھی ان لوگوں کی گفتگو سنتے اور کبھی حضرت امّ سلمہؓ اور حضرت صفیہؓ کی خدمت میں جاتے اس لیے کہ یہ دونوں امہات المومنین بلاواسطہ اور راست رسولؐ سے روایت فرمایا کرتیں اور سیرت و سنّت بیان کیا کرتی تھیں۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ظلم و ستم کے خلاف ہر انقلاب کامیاب اور نتیجہ خیز نہیں ہوا کرتا لیکن اتنا ضرور ہوتا ہے کہ عوام کے افکار بیدار ہو جاتے ہیں، ان کے کچھ ہاتھ پاؤں کھلتے ہیں۔ یہ بھی مسلّم ہے کہ ہر اقدام کے لیے ایک وقت، ہر بات کے لیے ایک موقع اور ہر کام کا ایک محل ہوتا ہے اور اس کو ایک نکتہ داں ہی سمجھ سکتا ہے کہ کس کام کے لیے کونسا وقت مناسب ہے۔ اگر امام حسن علیہ السلام کی صلح پر اس نہج سے گفتگو کی جائے تو مناسب ہے اس لیے کہ آپؑ کی صلح نے وہی اثر دکھایا جو ایک پُرتشدّد انقلاب و احتجاج سے ہوا

کرتا ہے۔

آپؑ امامِ وقت تھے، واقفِ اسرار و رموز تھے۔ آپؑ نے دین کی فلاح ہتھیار اُٹھانے میں نہ دیکھی بلکہ اس وقت صلح کے حربے کو تلوار سے زیادہ تیز سمجھا۔ کوتاہ بین معاویہ جو آپؑ کے مدِمقابل تھا خوش ہو گیا اور وہ خوش اس پر ہوا کہ اس کو کتنی آسانی سے اس کا موقع مل گیا کہ امامؑ کے خلاف اب اس کی جنگ در پردہ اور گہرائیوں میں اُتر کر ہو گی۔ اس لیے کہ اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ آلِ محمدؐ کے خلاف تلوار سے کام لینا درحقیقت خاندان بنی امیہ کے لیے خودکشی کے مترادف ہے۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ تلوار ان بے گناہوں کو ذلیل و رسوا کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ بنی امیہ کی خونچکاں تلواریں آلِ محمدؐ کے شہیدوں کی بیگناہی اور سربلندی ثابت کرنے کا ذریعہ بن جائیں گی۔ اس لیے صلح ہی ایک ایسی صورت ہے کہ جس کے ذریعہ شجرِ اسلام کی جڑ کاٹی جا سکتی ہے۔ اس کے ذہن میں یہ تھا کہ امام کے سکوتِ ظاہری میں نہایت آسانی کے ساتھ ابوہریرہ جیسے حربوں سے اسلام پر ضرب لگائی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کی یہ سوچ کس قدر غلط، بے سود اور بے فائدہ تھی تلواروں کی جھنکاروں میں تو شاید اس کا یہ مقصد کچھ پورا بھی ہو جاتا لیکن صلح میں تو یہ ممکن ہی نہ تھا۔

کیونکہ امام حسن مجتبیٰؑ اگر خاموش ہیں تو ان کی خاموشی ایک مستقل گویائی ہے۔ وہ فرزندِ رسولؐ ہیں، فرزندِ دین و ایمان ہیں، فرزندِ راہِ نجات ہیں۔ یہ وہ دریا ہیں کہ جس نے سرچشمۂ محمدیؐ سے آبِ خالص و شیریں حاصل کیا ہے۔ اگر بالفرض یہ زمین کی گہرائیوں میں بھی اُتر کر خاموش بیٹھ جائیں تو ان کی آواز زمین کے تمام طبقات کو توڑتی ہوئی سطحِ زمین پر پہنچے گی اور سارے زمانے کو سنائی دے گی۔

آپؑ کا حسب و نسب شاہد ہے کہ آپ فرزند امیر المومنینؑ ہیں، دلبندِ جوشش و خروش ہیں، جگر بندِ عظمت و جلالت ہیں۔ اگرچہ آپؑ نے سکوت اختیار کرلیا ہے لیکن یہ سکوت دراصل ایک فریاد ہے اور صرف انہی کی نہیں اسلام کی فریاد ہے۔

معاویہ نے صلح کی پیشکش تو کردی لیکن یہ باتیں اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں ورنہ وہ صلح کو کب پسند کرتا۔ وہ ان باتوں کی اہمیت سے تو واقف تھا مگر اس کا خیال تھا کہ امام حسن مجتبیٰؑ اگر کریں گے بھی تو برسوں کے بعد آواز بلند کریں گے مگر اس کا یہ خیال غلط نکلا، اس کا یہ وہم پاش پاش ہوگیا کیونکہ آپ کی خاموشی خود ایک زبان بن گئی تھی۔

اس کو معلوم تھا کہ حیدر کرارؑ کے یہ دونوں فرزند اپنے باپ کا نمونۂ کامل ہیں خواہ جنگ کریں خواہ صلح بہرحال دونوں کے مقاصد ایک ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں۔ ان سے ٹکراؤ تو باقی رہے گا، تصادم تو ختم نہیں ہوسکتا۔ اس لیے وہ سہما ہوا سا رہتا تھا۔ لہٰذا اس نے طے کیا کہ اس خاموشی کی زبان سے بولنے والے کو راستے سے ہٹا دیا جائے تاکہ اپنے ظلم و ستم کی حکومت مضبوط بنیادوں پر استوار ہوسکے۔

چنانچہ یہ اپنے زمانہ کے شجاع ترین اور اسلام کے بہترین فداکار انسان یعنی امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام، معاویہ کے اشارے پر ایک زر پرست عورت کے ذریعہ زہر سے شہید ہوگئے[1]

اور یہ بچہ (یعنی حضرت سید سجادؑ) جو دنیائے اسلام کی رہبری کے لیے ابھی

---

[1] ۲۸ر صفر سنہ ۵۰ھ

نشوونما پا رہا تھا، آغازِ شباب ہی میں ایک راہ نمائے اسلام کی شہادت کا صدمہ اٹھاتا اور دل پر چوٹ کھاتا ہے اور وہ بھی سخت ترین چوٹ۔ پھر یہ چوٹ آخری بھی نہیں بلکہ یہ تو ابھی ابتدا ہے، یہ تو ابھی عاشورا کا آغاز ہے۔ یہ بچہ ایامِ طفولیت نیز عہدِ شباب میں ایسے صدمات برداشت کرنے کا عادی بن رہا ہے تاکہ بعدِ کربلا مصائب سے نہ گھبرائے اور دیکھ لے کہ ایک عظیم رہبر اور ایک عظیم انسان اس معیار کا ہوتا ہے۔ معلوم نہیں اس میں کیا راز ہے کہ اہلبیت عصمت و طہارتؑ کا جس طرح تقویٰ اعظیم ہے اسی طرح ان کے مصائب بھی عظیم ہیں۔

بہرحال اگر ایک عظیم چچا دنیا سے رخصت ہوا تو ابھی آپ کا عظیم باپ موجود ہے جو دین و آئینِ محمدیؐ کی مسلسل رہنمائی و حفاظت کے لیے موجود ہے اور اب تک جو نگینۂ امامت چچا کی انگوٹھی پر تھا اب باپ کی انگوٹھی پر نظر آرہا ہے اور ہوسکتا ہے کہ باپ نے اسی وقت اشارے سے یہ بھی بتا دیا ہو کہ ایک انتہائی خطرے کے دن یہ نگینۂ امامت تمہاری طرف منتقل ہوجائے گا۔ چنانچہ روزِ عاشور امام حسینؑ شہید ہوئے اور یہ نگینۂ امامت حضرت سید سجادؑ کی طرف منتقل ہوا اور اسی کے ساتھ یہ ذمہ داری اور منجانب اللہ ذمہ داری کہ کربلا کی آواز دبنے نہ پائے، اسے لوگوں کے کانوں تک شہر بہ شہر، دیار بہ دیار اور کوچہ بہ کوچہ پہنچایا جائے خواہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں انھیں کتنے ہی مصائب کیوں نہ جھیلنے پڑیں۔

عہدِ امام حسین علیہ السلام

امام حسن مجتبیٰؑ کے بعد اب معاویہ ہے اور اسلام کا نیا رہبر، رسولؐ کا چھوٹا نواسہ۔ معاویہ آلِ محمدؐ کے کردار کو جانتا تھا اور سمجھتا تھا کہ امام علیہ السلام

اپنے بھائی کے معاہدۂ عدم جنگ کا ضرور احترام کریں گے اور اس کے خلاف برسرِپیکار نہ ہوں گے۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اموی نظریہ کی تبلیغ اور ہاشمی نظریہ پر ضرب لگانی شروع کر دی۔ بلکہ اس کے سارے حملوں کا نشانہ صرف تنہا ایک انسان تھا، وہ انسان جو تنہا حقیقی انسانیت کا نمونۂ کامل تھا، وہ انسان جس کا نام امویوں کے اثر و نفوذ کے آگے بڑھنے میں سب سے زیادہ سدِّ راہ بنا ہوا تھا، وہ انسان جس کا اسمِ گرامی امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ تھا۔ معاویہ کے متبعین نے ان کو بدگوئی و ملامت کا نشانہ بنانا شروع کر دیا اور اسلامی ملک کے وہ منابر جنھوں نے آج تک حضرت علیؑ سے بہتر کوئی خطیب نہیں دیکھا تھا آج وہی منابر حضرت علیؑ کی دشنام دہی کی جگہ بن گئے تھے۔

معاویہ بزدل پلید فطرت تھا اس لیے اس نے یہ روش اختیار کی۔ اس میں مردانِ خدا سے مقابلہ کی جرأت و ہمت نہ تھی اس لیے اس نے ذِلّ و فریب سے کام لیا اور ایک بھوکی لومڑی کی طرح حصولِ شہرت کے لیے مدتِ دراز تک دشنام طرازیوں کی کمین گاہ میں بیٹھا رہا۔

تعلیماتِ محمدیؐ سے عمومی توجہات کو ہٹانے کے لیے اس کی دوسری کوشش یزید کے لیے عوام سے بیعت[1] کا حصول تھا اور یہ کام اُس معاہدہ کے بالکل خلاف تھا جو اس نے کیا تھا۔ امام حسنؑ کی موجودگی میں تو یہ ممکن ہی نہ تھا جب تک وہ اس عظیم اور یگانۂ روزگار انسان کو شربتِ مرگ و شہادت نہ پلا لیتا اپنی اس خواہش کو پورا نہیں کر سکتا تھا۔ جب وہ ایسا کر گزرا اور اب امام حسن مجتبیٰؑ نہیں رہ گئے تو راستہ صاف تھا۔ اب اس نے بیعتِ یزید کے لیے ہر ناجائز کام کو اپنے لیے جائز کر لیا مگر وہ امام حسن مجتبیٰؑ کے بعد اس نئے

[1] سنہ ۵۶ھ

رہبر اور نئے پیشوائے اسلام یعنی امام حسینؑ کو کیا کرے۔

امام حسین علیہ السلام اور سوالِ بیعتِ یزید

گلستانِ عصمت و نبوت میں متعدد پھول کھلے اگر ایک پھول توڑ بھی لیا گیا تو اس سے پورا باغ اجاڑ نہیں ہو سکتا۔ امام حسینؑ بوستانِ عدالت و حریت کے گُلِ نو دمیدہ ہیں۔ یہ شجاعت و جوانمردی کے نخلِ باسق کی ایک شاخِ بلند ہیں۔ کسی کی بیعت کے لیے ان کا ہاتھ نہیں جھک سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ حسینؑ ایک شیرِ غضبناک ہیں، اسے ڈر تھا کہ کہیں ان کو غصہ نہ آجائے۔ اس لیے اس نے بزورِ طاقت نہیں بلکہ بہ نرمی و خوشامد چاہا کہ امامؑ کو یزید کی بیعت کے لیے راضی کرے لیکن وہ اس کی ان پرفریب باتوں میں کب آنے والے تھے۔ وہ تمام عالمِ اسلام کی اُمیدگاہ ہیں، ان کا وجود برائیوں کے آگے ایک مزاحمت ہے، وہ نیکیوں کے نمائندہ ہیں۔ وہ بھلا یزید پلید و بدکردار کی بیعت کرنے والوں میں کیسے شامل ہو سکتے تھے۔

اور تعجب اس کا ہے کہ معاویہ اپنی تمام تر چالاکیوں، مکاریوں اور حیلہ گریوں کے باوجود غلط فہمی میں مبتلا تھا اور اپنے اس خیالِ خام کو پختہ کرنے کا خواہشمند تھا اگرچہ اس کو اپنی اس خواہش میں ناکامی کا بھی ڈر تھا مگر پھر بھی اسی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح امامِ عالیمقامؑ کو ہموار کر لے کہ اسی میں اسے موت آگئی[1] مگر موت سے پہلے اس نے یزید کو وصیت کی کہ دیکھنا فرزندِ زہرا سلام اللہ علیہا کے عزت و وقار کے خلاف کوئی حرکت نہ کرنا۔ سب سے اُلجھنا لیکن ان سے

[1] لوگوں نے سنہ [illegible] تحریر کیا ہے۔

الجھنے کی کوشش نہ کرنا۔

اور واقعاً اگر کوئی انسان لومڑی کی طرح مکاری اور حیلہ جوئی سے کام لیتا رہے تو خواہ مخواہ اسے ایک آدھ لقمہ تو مل ہی جاتا ہے۔ اور معاویہ ایسا ہی شخص تھا مگر یزید عقل وفہم سے عاری، غرقِ مے نوشی، زنانِ بازاری سے ہم صحبت کتوں سے ہمکنار۔ کیا وہ ناسمجھی کے سوا کوئی دوسرا راستہ اختیار کر سکتا تھا۔ وہ نوجوان کہ جس کو شراب نے عقل سے دُور کر دیا ہو، درباریوں کی خوشامد نے جس کے اندر خود بینی اور تکبر پیدا کر دیا ہو، زنانِ بازاری جس کے جسم کو اپنے آغوش میں رکھے رہتی ہوں کیا ایسا شخص تختِ حکومت پر بیٹھ سکتا ہے یا سُکانِ کشتیٔ ہدایت کے رُخ کو موڑ سکتا ہے۔ اس نے بے سوچے سمجھے حکم جاری کر دیا کہ جس صورت سے ممکن ہو خواہ بہ رضا اور خواہ بہ جبر، امام سے بیعت حاصل کی جائے۔

حاکمِ مدینہ[1] کو حصولِ بیعت پر مامور کیا گیا مگر وہ اپنے خلیفہ کو سوائے اس کے اور کیا جواب روانہ کر سکتا تھا کہ امام حسینؑ اس کو حکومت کا اہل نہیں سمجھتے لہٰذا وہ اس کی ظالمانہ اور فاسقانہ حکومت کو ہرگز ہرگز تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

ایک ناشائستہ حکومت کے لیے اس سے سخت اور کیا جواب ہو سکتا ہے ظالم حکومتوں کا ہمیشہ یہی دستور رہا ہے کہ وہ اپنی بے جا مدح وستائش کو بڑے دھیان سے سنتے اور خوش ہوتے ہیں اور تلخ حقائق کو سُن کر مُنہ پھیر لیتے ہیں اور غیظ میں آجاتے ہیں۔

یزید کو خیال آیا کہ میرے باپ نے جب بھی لوگوں سے میرے لیے بیعت لینے کی کوشش کی مسلمانوں میں سے کسی نے کھل کر اس کی مخالفت نہیں کی لیکن

---

[1] ولید بن عتبہ

یہ ایک پیشوائے اسلام ہے جو ہر مقام پر صاف اور واضح طریقے سے میری نااہلی اور نالائقی کو لوگوں کے دلوں میں بٹھاتا اور میری کمزوریوں کو برملا لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے۔

لہٰذا اب اس نے امامؑ سے ان سب کا انتقام لینے کی ٹھان لی اور امامؑ کی ملامت سے جو زخم اس کے دل میں پڑے ہوئے تھے اس پر مرہم رکھنے کی کوشش کی اور اس زخم کا مرہم صرف یہ تھا کہ امامؑ سے اس کی اطاعت قبول کرا لی جائے اور آپؑ اس کی حکومت کو تسلیم کر لیں۔ لیکن یہ ایک امرِ محال تھا کہ فرزندِ رسولؐ وہ کریں جو یزید چاہتا ہے۔ آپؑ نے انکار کر دیا اور اس انکار سے برافروختہ ہو کر اس نے امامؑ کے خون سے اپنا ہاتھ رنگین کرنے کا ارادہ کر لیا اور نتیجہ میں وہ ہو گیا جو نہ ہونا چاہیے تھا۔

یثرب سے سفر

طلبِ بیعت کے بعد امامؑ نے ایک نظر مدینہ پر ڈالی تو دیکھا کہ یہاں کچھ اور ہی رنگ ہے اور دستگاہِ سیاست وحکومت سے کچھ اور ہی مہک آرہی ہے۔ لہٰذا محسوس کیا کہ اب مدینہ میں آپؑ کا رہنا مناسب نہیں حالانکہ آپؑ کے رہنے کے لیے اس سے بہتر اور کونسا مقام ہو سکتا ہے۔ مدینہ آپؑ کی جائے پیدائش ہے، مدینہ آپؑ کی پرورش گاہ ہے، مدینہ آپؑ کے جد کا مدفن ہے، مدینہ آپؑ کی ماں کی خوابگاہ ہے۔ یہاں آپؑ کے بھائی کا مزار ہے۔ اس شہر سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں، اس سے آپؑ کو دلی لگاؤ ہے۔ مدینہ کو انھیں کے خاندان نے مدینہ بنایا، مدینہ کو انھیں لوگوں نے یہ مقام دیا، انھیں محترم ہستیوں کی وجہ سے مدینہ محترم ہوا ہے۔ یہاں سے کوچ آپؑ کے

لیے کس قدر تکلیف دہ ہے، مگر ڈر یہ ہے کہ حکومت کہیں حرمتِ مدینہ کو [illegible] نہ کر دے۔

اس لیے آپؑ نے مدینہ چھوڑا اور مکہ معظمہ کا رُخ کیا۔ اس طرح آپؑ موت سے بھاگ نہیں رہے تھے بلکہ موت کی طرف جا رہے تھے۔ اپنے اس مقدر کی طرف سفر کر رہے تھے جس کا انجام معلوم تھا۔ اور ایک مردِ باخدا کے لیے یہ معلوم ہونا بہت آسان ہے۔

امام حسینؑ کے لیے مکہ بھی جائے امن نہ رہا

مکہ معظمہ ہمیشہ فرزندِ رسولؐ کو بڑی گرمجوشی سے خوش آمدید کہا کرتا تھا مگر اس مرتبہ یہاں کی فضا بھی بدلی ہوئی سی ہے۔ اس شہر میں یزید کے فرستادہ دشمنانِ دین آئے ہوئے ہیں اور ہر آن امامؑ کے قتل کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ یہ امرِ حرام، بیت اللہ الحرام میں انجام دیں اور پسرِ مولودِ کعبہ کا خون حریمِ کعبہ میں بہا دیں۔

ادھر حکومتِ یزید سے امامؑ کی مخالفت، بیعت سے انکار اور مدینہ سے ہجرت کر کے مکہ میں آمد کی خبر لوگوں کے کانوں تک پہنچی جس کو اہلِ کوفہ نے بھی پوری اہمیت سے سُنا، ان کے جذبات ابھرے اور چاہا کہ اس نااہل حکومت کے مخالفین کی صف میں کھڑے ہوں اور خود کو زمانہ کے بہاؤ کے سپرد نہ کریں اور فرزندِ رسولؐ کی قیادت میں یزید کے خلاف اقدام کریں۔

اہلِ کوفہ کے خطوط

اہلِ کوفہ نے مکہ کی طرف امامؑ کے پاس بہت سے خطوط اور قاصد روانہ کیے اور درخواست کی کہ آپؑ کوفہ تشریف لائیں۔ حسبِ حکمِ الٰہی امامؑ کا تو یہ فریضہ تھا ہی کہ ظالم و فاسق حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں، اس لیے آپؑ نے کوفہ کے لوگوں کی دعوت کو قبول کر لیا اور اپنے ایک سفیر مسلم بن عقیلؑ کو کوفہ کی جانب روانہ کیا تاکہ وہ وہاں پہنچ کر اس امر کا جائزہ لیں کہ کیا واقعتاً وہاں کے لوگ صدقِ دل سے آپؑ کو بلانا چاہتے ہیں۔

اہلِ کوفہ حضرت مسلمؑ کے گرد جمع ہونے لگے اور سب نے اس ظالم و فاسق حکومت کے خلاف اُٹھنے اور اپنی جان کی بازی لگا دینے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ جب امام حسینؑ کو اہلِ کوفہ کی آمادگی کی اطلاع دی گئی تو آپ نے پیغام بھیجا کہ میں کوفہ آ رہا ہوں اور جب تم لوگ آمادۂ نصرت ہو تو میں ظلم و فساد کے خلاف اقدام کروں گا۔

ادھر اہلِ کوفہ کا یہ رنگ دیکھ کر یزید نے کوفہ کی حکومت ابنِ زیاد کے حوالہ کر دی اور اس نے آتے ہی اپنی سیاسی حکمتِ عملی کی بنا پر فرزندِ رسولؐ کے سفیر (حضرت مسلمؑ) کے گرد و پیش مجتمع لوگوں کو منتشر کر دیا اور قتل کرنے لگا۔ اس طرح وہ لوگ جو سب سے زیادہ چاہتے تھے کہ امامؑ جہاد کریں وہ جان کا خطرہ دیکھ کر آسانی کے ساتھ کنارہ کش ہو گئے اور صرف جان بچانے کے لیے انتہائی بزدلی و نامردی کے ساتھ اپنی عزت، اپنی آبرو، اپنی شرافت اور اپنی آزادی سب کی موت پر راضی ہو گئے۔ مگر ان غداریوں کی اطلاع درمیانِ راہ میں پانے کے بعد بھی امامؑ چونکہ ارادہ کر چکے تھے اس لیے اپنے عزمِ جہاد پر قائم و دائم رہے اور

کوفہ کی طرف بڑھے تاکہ اللہ کی طرف سے عائد شدہ فریضہ ادا کریں اور اہلِ کوفہ پر واضح کر دیں کہ اگر تم لوگ ظلم کے خلاف جہاد میں ہماری نصرت کے وعدہ سے پھر گئے تو پرواہ نہیں۔ تم بزدل تھے کہ ظلم کے سامنے تم نے سرِ تسلیم خم کر لیا۔ میں بزدل نہیں ہوں، میں اپنے فریضۂ جہاد کو ادا کروں گا۔ جان دے دوں گا مگر ظلم کے سامنے سپر انداختہ نہ ہوں گا۔

کربلا میں ورُود

امامؑ منزل بہ منزل بڑھتے گئے، جب کوفہ کے قریب پہنچے تو دیکھا اہلِ کوفہ ہم سے جنگ کے لیے آئے ہیں اور ان میں اکثر وہی لوگ ہیں جنھوں نے خط لکھ کر بلایا تھا اور اس عہد کا اظہار کیا تھا کہ آپؑ تشریف لائیں ہم لوگ آپؑ کی قیادت میں ظالم حکومت کے خلاف جنگ کریں گے، آپؑ کے لیے جان دیدیں گے مگر آج وہی لوگ جان لینے کے لیے تیار ہیں اور قتل پر آمادہ ہیں۔ مگر اس کے باوجود امام علیہ السلام سرزمینِ کربلا پر خیمہ زن ہو گئے۔

امامؑ نے انھیں بہت سمجھانے کی کوشش کی۔ ان کے خطوط دکھائے ان کے وعدے یاد دلائے، انھیں نصیحتیں کیں مگر یہ نصیحتیں ان عہد شکنوں اور ان غدّاروں کو ان کے نامعقول ارادوں سے نہ روک سکیں اور اس طرح تاریخِ انسانی میں تصادم اور انقلاب کی ایک عجیب شکل پیدا ہو گئی۔

اہلِ کوفہ نے فرزندِ رسولؐ سے خود درخواست کی تھی کہ آپؑ چند سال پہلے کیے ہوئے پُرانے معاہدۂ صلح کو چاک کر دیں اور حکومتِ باطل اور سربراہانِ بنی امیہ سے جہاد فرمائیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ مگر جب فرزندِ رسولؐ نے ان کی درخواست منظور کی اور چاہا کہ ان کی اس آرزو میں رُوح پھونکیں، اس کو عملی جامہ پہنائیں تو اہلِ کوفہ بالکل بدل گئے اور فرزندِ رسولؐ کو چھوڑ کر اس صف میں جا کھڑے ہوئے جس کو اس سے پہلے یہ لوگ پراگندہ کرنا چاہتے تھے، جس کے لیے ان لوگوں نے ہزاروں خطوط لکھے تھے اور آپؑ کو بلانے کے لیے بہت سے قاصد روانہ کیے تھے۔

مگر امام حسینؑ بھی اسلام کے شجاع ترین اور دلیر ترین انسان کے فرزند ہیں جو بے یار و مددگار تن تنہا انتہائی بہادری کا مظاہرہ کرنے اور ظلم و استبداد کی حکومت سے ٹکر لینے کے لیے اٹھے ہیں۔ اہلِ کوفہ کے بدل جانے سے امامؑ کی فکر و رائے میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ آپ نے جو ارادہ کر لیا تھا اس پر ثابت قدم رہے۔

اگر ان لوگوں نے اس لیے صفیں جمائیں کہ امامؑ کو قتل کریں تو لیں قتل کر دیں۔ اگر یہی طے ہے کہ ملّت کے پُرفتنہ و فساد گروہ کے خلاف جہاد میں شہادت، اور جان سے ہاتھ دھونا ہے، اگر یہی مسلّم ہے کہ اسلام کی جڑیں اس کے حقیقی متبعین کے خون سے مضبوط ہوں گی اور اس میں شادابی آئیگی تو یہ لو، حسینؑ اور حسینؑ کی جان حاضر ہے حسینؑ کا خون حاضر ہے، مگر یہ یاد رہے کہ حسینؑ کا خون، دینِ خدا کا خون ہے اور واقعاً اس ذات سے زیادہ قریبی رشتہ اسلام اور بانیٔ اسلام کا کسی سے نہیں ہے۔

روزِ عاشور اور امامؑ کا خطبہ

لو اب عاشور نمودار ہو چکی اور اے بنی اُمیّہ کے جلّادو سنو! اے تمام دنیا کے جلّادو سنو! اے بنی اُمیّہ کے ظالمو سنو! اے تمام زمانے کے ظالمو سنو! امام حسینؑ تمام عالم البشریت کو حریت، دعوت اور جوانمردی

کا پیغام دیتے ہیں گویا وہ کہہ رہے ہیں کہ :

"سمجھ لو کہ راہِ نجات میں ہوں، کشتیٔ نجات میں ہوں حریت اور آزادی کی علامت میں ہوں، اے غافلو! اے بیہودگیوں میں مبتلا لوگو! اے پریشان اور آشفتہ حال انسانو! اگر تم سلامتی چاہتے ہو، اگر نجات کے جویا ہو، اگر آزادی کے طالب ہو، اگر حق کے چاہنے والے ہو تو میری مدد کرو۔ اپنی تلواروں کو میری مخالفت میں نہیں بلکہ میری مدد کے لیے کھینچو، تمھاری جنگ جور و ستم کے خلاف ہونی چاہیے، تمھارا جہاد جابروں اور ظالموں کے مقابل ہونا چاہیے نہ کہ میرے خلاف۔ میں منتہائے عدل ہوں، میں معراجِ انسانیت ہوں، میں سراپا اسلام ہوں، تم لوگ جوش و خروش میں ضرور آؤ مگر اپنے اس جوش و خروش کو مفسدوں اور متکبروں اور ظالموں کے خلاف استعمال کرو۔"

یہ نصیحتیں کیا تھیں گویا ایک ابرِ رحمت تھا جو نیند کے ماتوں پر برس گیا مگر افسوس کہ اس کا کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ یہ بارش اس شور زمین پر ہوئی جس میں سوائے گھاس پھوس کے کچھ اور پیدا نہیں ہوتا۔ فوجِ مخالف اس پر تُلی ہوئی تھی کہ رسولؐ کے نواسے کی جان لے کر اور خون بہا کر رہیں گے اور ادھر حسینؑ کے جاں نثار انصار غلامی اور بندگی کی زنجیروں سے رہائی اور آزادی کے لیے موت کی پروا کیے بغیر اپنے خون میں نہا رہے تھے۔ اور اب وہ وقت آپہنچا کہ پسرِ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا خون بہے۔ سارے جاں نثار ایک ایک کر کے برگِ خزاں دیدہ کی طرح نقش بر زمین ہو چکے تھے۔ کسی کے ہاتھ کٹے ہوئے کسی کے پاؤں جسم سے جدا، کسی کے سینے پر برچھی کا زخم، کسی کا چہرہ خون سے تر۔ آسمان

ان کی جرأت و ہمت کو دیکھ کر حیرت زدہ تھا، دریائے فرات ان کی تشنگی پر اندر ہی اندر کھول رہا تھا اور زمین ان لاشہائے پارہ پارہ کو اُٹھائے ہوئے کانپ رہی تھی۔ یہ دردناک مصائب درحقیقت اس لائق ہیں کہ حریت و آزادی، ایمان، قوت، تقویٰ، وفاداری، حق طلبی اور ظلم و ستم کے مٹانے کے لیے علامت و نشان بن سکیں۔

نمازِ ظہر اور تیروں کی بارش

اس روز ان بہادروں کی پرشکوہ جانثاری اس وقت دیکھنے کے قابل تھی جب ان سب نے یہ طے کر لیا کہ اب زندگی میں اللہ تعالیٰ کی آخری عبادت امامؑ کی اقتدا میں باجماعت کھلے میدان میں ادا کریں چنانچہ نمازِ ظہر کے لیے صف آراستہ ہوئی۔ امامؑ آگے کھڑے ہو گئے اور چند جانباز بطورِ سپر امامؑ کے سامنے کھڑے ہو گئے تاکہ دشمن کی طرف سے امامؑ کی طرف جو تیر آئے اسے اپنے سینہ پر روک لیں اور امامؑ اپنی نماز تمام کر سکیں اور اس طرح ان جانبازوں نے اپنی بہادری کو منتہا کے بلندی پر پہنچا دیا مگر نتیجہ میں سب شہید ہو گئے اور دوسرے مجاہد بھی تیروں کی بارش سے خون میں نہا کر جاں بحق ہوئے اور اب صرف چار مجاہد زندہ بچے۔

امام حسینؑ اور ان کے وفادار بھائی۔

امام حسینؑ اور ان کے دو فرزند۔

بھائی کون، وہی قمر بنی ہاشم حضرت ابوالفضل العباسؑ۔ انھوں نے جوشِ شجاعت و انتقام میں اپنے آہنی بازوؤں اور بلند و بالا قد کے ساتھ اپنی تلوار سے مثلِ حیدرِ کرارؑ لشکرِ ستم پر حملہ کیا۔ آپؑ جرأت و شجاعت

کے تناور ترین درخت تھے۔ آپؑ نے اپنے اس بہادر باپ کے مکتب سے درسِ شجاعت لیا تھا جس کی ذوالفقار کے بہت سے قصے مشہور ہیں آپ اس شجاع کے فرزند ہیں جو سوائے خدا کے اور کسی سے نہیں ڈرتا تھا، جس نے اپنے کسی دشمن کے مقابلے سے پیٹھ نہیں پھیری۔ واقعاً ایسے بہادر باپ کا ایسا ہی بہادر بیٹا بھی ہونا چاہیے تھا۔

حضرت عباسؑ کربلا میں ایک حادثۂ عظیم برپا کرنا چاہتے تھے اور واقعاً انھوں نے حادثۂ عظیم برپا کر بھی دیا۔ اور اس سے بڑھ کر حادثۂ عظیم اب کیا ہوگا کہ آپؑ نے اپنی دلخراش شہادت قبول کر لی، ایسی شہادت کہ جس سے بھائی کی کمر ٹوٹ گئی اور وہ بے یار و مددگار رہ گئے۔

امامؑ کے دو فرزند کون؟ ایک حضرت علی اکبرؑ، جوان ہیں، بڑے بہادر ہیں، شکل میں مثلِ پیغمبرؐ ہیں، شجاعت میں مثلِ حیدرِ کرارؑ ہیں۔ آپؑ نے ایک شیرِ غضبناک کی طرح حملہ کیا اور ان خونخوار بھیڑیوں کی کوئی رعایت نہیں کی، مگر بالآخر وہ بھی شدتِ تشنگی اور جذبۂ شہادت میں اعدا سے سخت مقابلہ کرتے ہوئے شربتِ شہادت سے سیراب ہوئے۔[1]

اب امامِ عالیمقامؑ بالکل تنہا رہ گئے۔ آپؑ کا دوسرا فرزند تپِ شدید میں مبتلا ہے، بسترِ مرض پر ہے اور شدتِ تپ سے جسم پھنکا جا رہا ہے غش میں پڑا ہوا ہے مگر اس وقت یہ تپِ شدید بھی اللہ کی مصلحت ہے اور انسانیت کی نجات کے لیے ہے۔

غور کیجیے اگر اس وقت یہ تپ نہ ہوتا تو یہ بھی یقیناً تلوار اُٹھاتے، میدان میں جاتے، جنگ کرتے اور دیگر شہدا کی طرح درجۂ شہادت پر فائز ہوتے۔

[1] بعض لوگوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت علی اکبرؑ ہاشمی جوانوں میں پہلے شہید تھے۔

مگر ایسی صورت میں وہ کھیتی جسے امامؑ نے کربلا میں اپنے اور اپنے جوانوں اور اپنے انصار کے خون سے سینچا تھا اسے بارآور کون کرتا۔ اسی لیے اللہ نے اس فرزند کو تپ میں مبتلا کر دیا تاکہ اس کی جان بچ جائے اور یہ آئندہ انسانیت کی جان بچائے۔ انسانیت کو اس کی ضرورت تھی اس لیے اس کو زندہ رہنا چاہیے۔ اس کا زندہ رہنا ہی مقصدِ جہادِ عاشورا کی سب سے بڑی مدد ہے تاکہ یہ عاشورا کی آواز کو زمانے بھر کے دلوں میں بٹھا دے۔ لہٰذا واقعاً کسی کو تو زندہ رہنا چاہیے تھا کہ کربلا کے صحیح واقعات لوگوں کے کانوں تک پہنچائے۔

باپ اپنے بیمار بیٹے سے رخصت ہو رہا ہے

اس وقت یہ دونوں باپ بیٹے ایک خیمے میں ہیں اور شاید یہ دونوں ایک دوسرے کو بغور دیکھ رہے ہیں۔ باپ اپنے بیٹے کے چہرے پر تپ کے آثار دیکھ رہا ہے اور بیٹا باپ کے خون آلود چہرے کو۔ کسی کو کیا معلوم کہ یہ امامؑ اور یہ وصیؑ آپس میں کیا گفتگو کر رہے ہیں۔ اتنا معلوم ہے کہ امامؑ خیمے سے نکل کر تنہا میدان میں آئے اور نہ صرف اہلِ کوفہ کو بلکہ پوری تاریخِ انسانیت کو ہر دَور اور ہر زمانے کے انسان کو پکار کر کہا:

کوئی ہے جو اہلِ بیتِ رسولؐ کا دفاع کرے۔

کوئی اللہ کا ماننے والا ہے جو ہم لوگوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرے۔

کوئی فریادرس ہے جو ہم لوگوں کی فریاد کو پہنچے، اللہ اس کو جزائے خیر دے گا۔

کوئی مدد کرنے والا ہے جو ہم لوگوں کی مدد کر کے ثواب بے حساب حاصل کرے[1]۔

امام حسین علیہ السلام کی مدد درحقیقت تاریخ کے تمام ادوار میں ان کے نظریہ اور ان کے مسلک کی مدد ہے، اسلام کی مدد ہے بلکہ پوری انسانیت کی مدد ہے اور اگر اس وقت ان چند غافل اور ناعاقبت اندیش دشمنوں کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملتا تو نہ ملے، امامؑ اس سے مایوس نہیں۔ اس وقت بظاہر مخاطب اہلِ کوفہ ہیں، اس لیے کہ وہ سامنے ہیں ورنہ درحقیقت آپ کا یہ خطاب زمانے کے ہر دَور اور دنیا کے ہر خطّے کے انسانوں سے ہے۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ امامؑ ہم لوگوں سے مخاطب ہیں، ہم لوگوں سے بھی مدد کے طالب ہیں۔ آپؑ کا یہ استغاثہ دورِ حاضر کے انسانوں کے کانوں میں بھی پہنچ رہا ہے کہ میری نصرت کرو، میری سیرت اختیار کرو، میری مدد کرو۔

بیمار بیٹا باپ کی نصُرت کیلیے اُٹھا

جب امام مظلومؑ حجّت تمام کر چکے اور اپنی آواز لوگوں کے کانوں تک پہنچا چکے اور اپنے مقصد کو واضح کر چکے تو اب پوری آمادگی کے ساتھ جامِ شہادت نوش کرنے اور جان دینے کے لیے آگے بڑھے۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپؑ کے مقصد کی پیروی اور آپؑ کی آواز پر لبیک اس طرح کہا جائے جس طرح اس وقت آپؑ کے بیمار فرزند آپؑ کی آواز پر لبیک کہہ رہے تھے۔ وہ کانپتے ہوئے پاؤں سے اُٹھے، تلوار سنبھالی اور چاہتے تھے کہ میدان میں پہنچ کر فرزندِ زہرا سلام اللہ علیہا کی نصرت کرتے ہوئے اور شہداء کی طرح اپنی جان دے دیں۔ اور واقعاً یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اس داعیٔ انقلاب کی آواز سُنیں اور اس

---

[1] اللہوف علی قتلی الطفوف، ابن طاؤس، ترجمہ سید احمد زنجانی، صفحہ ۱۱۶

پر لبیک نہ کہیں۔ وہ خاموش نہیں رہ سکتے تھے اور باوجودِ علالت چاہتے تھے کہ باپ کی طرح آپؑ بھی اسلام کی نصُرت کریں کہ اتنے میں میدانِ کارزار سے ایک بے یار و مددگار، ایک بے کس و لاچار کی آواز بلند ہوئی کہ:

"سیّد سجادؑ کو روک لو، میدان میں نہ آنے دو کہیں ایسا نہ ہو کہ نسلِ آلِ محمدؐ ختم ہو جائے۔"

سچ ہے امام زین العابدینؑ کا فنا ہونا خاندانِ رسالت کا فنا ہونا ہے اور خاندانِ رسالت کا فنا ہونا درحقیقت انسانیت اور حریت کی رُوح کا فنا ہونا ہے۔

امامؑ کے اس ارشاد سے معلوم ہو گیا کہ امام زین العابدینؑ کو اللہ نے تپ میں کیوں مبتلا کر دیا تھا۔

شہادتِ امامِ مظلوم علیہ السّلام

اب میدان میں کیا ہو رہا ہے — انسانیت اور درندگی کے درمیان زبردست تصادم، شدید جنگ، ایک طرف تن تنہا ایک انسان دوسری طرف لاکھوں درندے۔ بالآخر قبل غروبِ آفتاب یہ داستانِ غم ختم ہوئی اور آزادی و حریت کے گلے پر چھری پھیر دی گئی۔

شہزادی زینبؑ کی فریاد

ان ظالموں کے اس ظلمِ عظیم پر حضرت زینب کبریٰؑ نے فریاد بلند کی۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ فرمایا:

"کاش آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر گر جاتا، کاش

پہاڑ پاش پاش ہو کر میدانوں میں بکھر جاتے "

اور اس وقت شہادتِ امامؑ کی دردناک خبر دوست دشمن دونوں کی زبان سے لوگوں کے کانوں تک پہنچی۔

مغرور قاتل خود کہہ رہا ہے کہ جس کو اس نے قتل کیا ہے وہ کتنا عظیم اور پرشکوہ تھا۔ وہ اپنے اس کارِ نمایاں پر انعام طلب کرتے ہوئے کہتا ہے:

اے امیر! میری رکابوں تک سونے اور چاندی کا ڈھیر لگا دے۔
میں نے تیرے حکم پر ایک شاہِ پردہ دار کو قتل کیا ہے۔
میں نے اس کو قتل کیا ہے جس کے ماں اور باپ دونوں سارے جہان سے بہتر تھے۔
میں نے اس کو قتل کیا کہ اگر کسی موقع پر لوگوں کے حسب و نسب کا ذکر چھڑے تو اس کا حسب و نسب سب سے بہتر ثابت ہو[1]

اور حضرت زینبِ کبریٰؑ کی آواز شہادتِ حسینؑ کی خبر لیے ہوئے زمانے کے سارے فاصلوں کو ختم کرتی ہوئی رسولؐ کے کانوں تک پہنچی۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ثانیٔ زہراؑ نے یوں فریاد کی:

"(وامحمداہؐ) نانا محمد مصطفےٰؐ! آپؐ پر خالقِ ارض و سما رحمت نازل فرمائے۔ دیکھیے یہ آپؐ کا نواسہ حسینؑ ہے جس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہے اور خاک و خون میں ڈوبا ہوا پڑا ہے۔
اور یہ دیکھیے یہ آپؐ کی نواسیاں ہیں جو رسن بستہ و اسیر ہیں۔

(اور درحقیقت یہی فریاد انھیں اپنے جد محمد مصطفےٰؐ کے ساتھ ساتھ علی مرتضیٰؑ اور حضرت حمزہؑ سید الشہدا، بلکہ خدا سے بھی کرنی چاہیے۔)

---

[1] سنان بن انس، تاریخ طبری صفحہ ۳۰۶۳

نانا یہ آپؐ کا حسینؑ ہے جسے اولادِ زنا نے قتل کر دیا اور جس کی لاش پر صحرا کی گرد اڑ اڑ کر پڑ رہی ہے۔
ہائے افسوس یہ مصیبت، یہ غم، یہ اندوہ، معلوم ہوتا ہے جیسے آج میرے نانا نے رحلت فرمائی ہے۔
اے رسولؐ کے صحابیو! دیکھو، یہ ہے تمھارے رسولؐ کی اولاد جسے رسن بستہ کشاں کشاں لے جایا جا رہا ہے۔
نانا جان! یہ ہیں آپؐ کی بیٹیاں جو اسیر ہیں اور یہ ہے آپؐ کی اولاد جو قتل کر دی گئی ہے اور ہوائیں ان کی لاشوں پر خاک افشانی کر رہی ہیں۔
یہ ہے آپؐ کا حسینؑ جس کا سر پسِ گردن سے جدا کر دیا گیا، جس کا عمامہ اور ردا تک لوٹ لی گئی"[1]

واقعاً حادثۂ کربلا میں زندگی کے سب سے زیادہ مصائب امام حسینؑ کے پسماندگان کو اٹھانے پڑے اور یہ حضرت ثانیٔ زہراؑ، دخترِ حیدرِ کرارؑ ہی کا کلیجہ تھا جو ان مصیبتوں اور تکلیفوں کو جھیل گئیں مگر کسی صاحبِ اقتدار کی یہ مجال نہ ہوئی جو انھیں کسی ننگ و عار کو قبول کرنے پر مجبور کر سکے اور نہ کسی نے کربلا کی اس شیر دل خاتون کے چہرے پر کبھی التجا و لجاجت کے آثار دیکھے۔

اور سچ ہے کہ بھائی نے یہ ننگ و عار کب قبول کیا جو بہن قبول کرتی شہیدِ کربلا کی شہادت کا مقصد ہی یہ تھا کہ انسانیت کے چہرے سے

---

[1] اس کے چند فقرے کتاب "طراز المذہب مظفری" تالیف عباس قلی سپہر، چاپ قدیم صفحہ ۱۹۳

ننگ و عار کی گرد کو پاک کرے اور اسے آزادی اور حریت کی لذت سے آشنا کرے۔ اس لیے بہن کو بھی وہی درس دینا چاہیے جو بھائی نے عالمِ انسانیت کو دیا ہے چنانچہ بھائی کی شہادت کے بعد دخترِ زہراؑ نے بارگاہِ خداوندی میں دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے اور عرض کیا :

" بارالہا ! تو ہم اہلبیت کی طرف سے اس قربانی کو قبول فرما "

یہ ہے آپؑ کی روحانیت کا وہ کمال جس کی تعریف ممکن نہیں، ایک وہ عورت جو بے شمار مصائب میں گھری ہوئی ہے کیا اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اس کے کردار و گفتار سے اس طرح کی روحانیت کا کا اظہار ہو ؟

حسینؑ کی بہن حسینؑ کے بعد تمام پسماندگان کی ڈھارس ہے۔

حضرت زینبؑ وہ ہیں کہ کربلا میں سارے مظالم اپنی آنکھوں سے دیکھتی رہیں، شہیدوں کے داغ اٹھاتی رہیں، مگر صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ کبھی گریبان چاک نہیں کیا۔ کبھی اپنے بال پریشان نہیں کیے اور دشمن کی طاقت سے کبھی مرعوب و مغلوب نہیں ہوئیں۔ ہاں انھیں شکایت ہے تو انسانیت دشمنی سے ہے اور یہ شکایت تاریخ کے اوراق پر باقی رہ جائے گی۔ آپ کا یہ پُر غیظ و غضب شکوہ اس دشتِ پُر مصیبت اور اس سرزمینِ بلاخیز سے بلند ہو کر تا ابد لوگوں کے کانوں تک پہنچتا رہے گا۔

شامِ عاشور یعنی شامِ غریباں کے بھیانک منظر کو دیکھتے ہوئے کیا ان مخدومۂ علیا سے یہ عرض نہیں کیا جاسکتا کہ :

اے غریب اور دکھیاری زینبؑ ! اے مصیبت زدہ زینبؑ ! تیرے بھائی کو شہید کر دیا گیا، تیرے بچوں کا خون بہا دیا

گیا، تیرے خیمے جلا دیے گئے، اب تو کہاں جائے گی، کہاں پناہ لے گی۔ کیا تیرا کوئی خیمہ سلامت رہ گیا ہے جس میں تو اپنے قافلے والوں کو سُلا سکے یا ان بیواؤں اور یتیموں کے سروں کے نیچے تکیہ نہ سہی کوئی اینٹ ہی رکھ سکے۔ کیا یہ اشقیا اس کی اجازت دیں گے۔

اے زینبؑ ! اے دشتِ کربلا کی مصیبت زدہ زینبؑ ! اب تو یہاں نہیں رہ سکتی۔ اب سرزمین کربلا تیرے لیے اور تیرے پیغام کے لیے تنگ ہے۔ تجھے یہ سرزمین خود چھوڑ دینی چاہیے۔ یہاں تیرا سارا کُنبہ تباہ ہوگیا۔ ساری بضاعت لُٹ چکی اب تو یہاں رہ کر کیا کرے گی۔

ہاں اب تجھے ظالم کے دربار میں چلنا چاہیے، اس کے اقتدار کی چولیں ہلانی چاہئیں، اپنے بھتیجے کے ساتھ اپنے بھائی کے پیغام کو پھیلانا چاہیے۔ تجھے چاہیے کہ شہیدِ روزِ عاشورا کی شجاعت و جوانمردی کی داستانیں عالمِ بشریت کے کانوں تک پہنچائے۔

شہزادی زینبؑ ! آج سے آپ کے بھتیجے امام زین العابدینؑ کی امامت اور پیغام رسانی کا آغاز ہے۔ وہ اس وقت بالکل تنہا ہیں، وہ اپنے اسلاف کے باعظمت کارناموں کے وارث ہیں، اسلام و کفر کی درمیانی سرحد پر کھڑے ہیں۔ انھیں اکیلا نہ چھوڑیے، ساتھ چلی جایئے۔

بیمارِ کربلا کی ذمّہ داریاں

ایک مردِ بیمار اور ناتواں اور اس پر اتنی ساری ذمّہ داریاں، اور سب سے زیادہ اہم ذمّہ داری تو یہ ہے کہ اتنی ساری پابندیوں میں رہ کر اپنا پیغام عالم بشریت تک پہنچانا ہے۔

کیا ان کے علاوہ کسی اور امام کو بھی ایسے سخت ترین حالات میں امامتؑ قیادت سنبھالنی پڑی ہے اور کیا اس وقت اس اہم کام میں ان کا کوئی اور یاور و مددگار ہے؟

پیغمبرِ اسلامؐ کو اسلام کو طاقت پہنچانے کے لیے امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کی شجاعت و دلیری میسّر ہوئی نیز دیگر اصحابِ باوفا سے مدد ملی۔ امیر المومنینؑ کو خلافت ظاہری سنبھالتے وقت اطمینان تھا کہ خود ان کے اپنے دو جوان فرزند موجود ہیں۔ مگر افسوس سیّد سجّادؑ اس وقت تن تنہا ہیں کس سے اُمید کریں اور نصرتِ اسلام کے لیے کس کو بلائیں ہمارے قافلے والے کوچ کر چکے، صرف ایک بزرگ خاتون ہیں جو قدم قدم پر پشت پناہی کر رہی ہیں، ڈھارس بندھا رہی ہیں۔ لیکن کوئی انھیں ایک تنہا اور معمولی خاتون نہ سمجھے۔ یہ ایک بہترین انسان کی اعلیٰ ترین خصوصیات لیے ہوئے ایک مکمل پیکار اور مزاحمت ہیں۔

لیجیے پیغام کو عام کرنے کا وقت آ گیا لیکن اس محاذ پر نہ اسلحوں کی ضرورت ہے نہ مبارز طلبی اور شمشیر زنی کی حاجت۔ نہ کسی میدانِ جنگ کی احتیاج، نہ سامانِ جنگ کی۔ یہاں دین کی فلاح کے لیے عوام کے افکار کو بیدار کرنا ہے اور اس کے لیے صرف پُر اثر خطبے کافی ہیں۔

مقصد تو پہلے ہی سے متعین تھا۔ اب حصولِ مقصد کے لیے حسبِ حالات طریقۂ کار میں تھوڑی سی تبدیلی کی ضرورت تھی اور یہ ہر زمانے اور ہر مقام پر دنیا کا دستور رہا ہے کہ اپنے حالات کے مطابق اپنے اندازِ اقدام میں تھوڑی بہت ترمیم کر لیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر زمانے اور ہر مقام کا معاشرہ جدا جدا ہے اور پھر ایک مقام یا زمانے کا ایک معاشرہ بھی عرصۂ دراز تک ایک حال میں نہیں رہتا۔ نیز ایک انسان کے خیالات بھی بدلتے ہی رہتے ہیں۔ اس لیے طریقہ ہائے جنگ بھی ہمیشہ یکساں کیسے رہ سکتے ہیں۔ اس میں بھی حالات کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ تبدیلی ضروری ہے اور پھر ایک مقصد کے حصول کے لیے بھی مختلف طریقے ہوتے ہیں اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی وہی شخص ہوتا ہے جو اس کے حصول اور موقف کے تحفظ کے لیے قوم و ملّت کے مزاج سے آشنا ہو اور اس کے مطابق اپنی راہ متعین کرے۔ اسی لیے اگر حضرت امیر المومنینؑ اور آپؑ کے چھوٹے فرزند حسین بن علیؑ نے تلوار کو حفاظتِ حق کا ذریعہ بنایا اور اگر امام حسن مجتبیٰؑ نے صلح اور گوشہ نشینی قبول فرمائی تو وقت اور حالات کے لحاظ سے یہی مناسب تھا۔ آپؑ نے دیکھا کہ ظالم حکومت بھی اب تلوار سے دست کش نظر آ رہی ہے اور چاہتی ہے کہ حق کی بنیادوں کو لباسِ تحقیر و تذلیل میں پیش کر کے درہم و برہم کر دیا جائے اور حق پر حملے میدان کے بجائے منبر سے کیے جائیں۔ اس لیے حق کا دفاع کرنے والوں نے بھی تلوار نیام میں رکھ لی اور زبان سے کام لیا۔ اپنی گفتگو، خطابت اور تقریروں سے حق کا دفاع کیا اور لوگوں کے افکار کو بیدار کیا۔

ظالم و جابر حکومت کے سامنے کلمۂ حق کا زبان سے جاری کرنا، یہ بھی ایک طرح کا جہاد ہے۔ بلکہ یہ جہاد بالسیف سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

اسیرانِ کربلا کا کوفہ میں داخلہ

گیارہ محرم کی شب تو ان بیواؤں اور یتیموں پر کسی نہ کسی طرح گزر گئی مگر گیارہ محرم کی صبح کو انھیں شترانِ بے کجاوہ پر سوار کرا کے کوفہ کی طرف روانہ کر دیا گیا اور بارہ محرم کو امام زین العابدینؑ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں پہنے ہوئے کوفے کی شاہراہوں پر نمودار ہوئے۔ پیچھے پیچھے بیواؤں اور یتیموں کا قافلہ آگے آگے نوکِ نیزہ پر شہدا کے سر۔ شہر میں پہلے ہی اعلان ہو چکا تھا کہ چند اسلام دشمن عناصر اسیر ہو کر آ رہے ہیں۔ حکومت چاہتی تھی کہ اس طرح سے ان اسیروں کے خلاف عوام کے جذبات بھڑکائے اور اپنے جرائم کی پردہ پوشی کرے تاکہ لوگ خیال کریں کہ یہ بہت مناسب اقدام ہوا کہ دشمنانِ اسلام کو موت اور قید کی سزا دی گئی۔ مگر جس وقت اسیرانِ کربلا کا یہ ماتم کناں قافلہ شہر کے کوچوں اور شاہراہوں سے ہوتا ہوا گزرا تو لوگوں کو کچھ پہچانے ہوئے خد و خال نظر آئے، کچھ گوش آشنا لب و لہجے سنائی دیے اور ان کی باتیں اسلامی آئین کے موافق پائی گئیں۔

درحقیقت ابنِ زیاد کی یہ سب سے بڑی سیاسی غلطی تھی کہ اس نے دن کے وقت روزِ روشن میں اسیروں کے قافلے کو شہر میں داخل کیا کیونکہ امام زین العابدینؑ اور حضرت زینبِ کبریٰؑ کو کوچوں اور بازاروں میں تماشائیوں کا بنا بنایا اور بالکل تیار مجمع مل گیا اور انھوں نے حکومتِ باطل کے خلاف حملے شروع کر دیے۔

امام زین العابدین علیہ السلام کا اہلِ کوفہ سے خطاب

چنانچہ حضرت امام زین العابدینؑ نے اہلِ کوفہ سے جو اس عظیم حادثہ

کا سبب بنے تھے پکار کر کہا:

" ایہا الناس! تم لوگ اس سے پہلے بھی ایک پاک پاکیزہ اور پسندیدۂ حق ہستی کو قتل کر چکے ہو اور اب تمھاری ہی وجہ سے آج جو مجھ پر اور ان کے اہلبیتؑ پر یہ مصیبت آئی ہے اس پر کم از کم خوشیاں تو نہ مناؤ۔ شرم کرو، یہ تم لوگوں سے بہت بڑا گناہ سرزد ہوا ہے "[1]

یہ سن کر مجمع میں سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔ یہ قیدی کون ہیں ــــ؟ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔؟ ان کا دین کیا ہے ـــ؟ ان کا مذہب کیا ہے ـــ؟ یہ کہاں کے رہنے والے ہیں ـــ؟ کہاں سے آ رہے ہیں ـــ؟ اور جو یہ بتا رہے ہیں کہ کربلا کا حادثہ کیوں رونما ہوا اور پسرِ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے ظالموں کے خلاف کیوں ایسی جان لیوا جنگ چھیڑی؟

مجمع کو ہمہ تن سوال دیکھ کر امامؑ نے ان کی طرف رُخ کیا اور فرمایا:

" ایہا الناس! تم لوگوں میں جو ہمیں جانتا ہے وہ تو جانتا ہی ہے مگر جو نہیں جانتا اُسے میں خود بتا دوں کہ میں کون ہوں تاکہ اسے بھی معلوم ہو جائے۔ سنو! میرا نام علی ابن الحسین ابنِ علی ابن ابی طالبؑ ہے میں اس کا فرزند ہوں جس کو نہرِ فرات کے کنارے پسِ گردن سے ذبح کر دیا گیا حالانکہ اس نے کسی کا خون نہیں بہایا تھا، نہ وہ کسی سے خون کا انتقام

---

[1] ناسخ التواریخ۔ جلد ۷۔ حضرت سجاد، صفحہ ۱۴۱

چاہتا تھا۔

میں اس کا فرزند ہوں جس کا سارا جاہ وحشم تباہ کر دیا گیا۔ جس کی سرکار لوٹ لی گئی۔ سارا سامان چھین لیا گیا اور جس کے اہل وعیال کو قیدی بنا کر آج تمھارے شہر میں لایا گیا ہے۔

میں اس کا فرزند ہوں جس کو تیروں، تلواروں، نیزوں اور پتھروں سے مار مار کر شہید کر دیا گیا۔

لوگو! میں تمھیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں بتاؤ کیا تم نہیں جانتے کہ میرے پدرِ بزرگوار کو خطوط تمھیں لوگوں نے بھیجے تھے۔ تمھیں لوگوں نے انھیں یہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ اور جب انھوں نے تمھارے بے حد اصرار پر تمھاری اس دعوت کو قبول کر لیا اور اِدھر آ گئے تو پھر تم لوگ اپنے عہدو پیمان سے پھر گئے، مکر و فریب سے کام لینے لگے اور یوں بن گئے جیسے یہ عہد وبیعت ان سے کرنا تو درکنار، دیکھا بھی نہیں۔

تم نے صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ تم نے انھیں بے یار و مددگار چھوڑا۔ ان سے جنگ کی اور انھیں قتل کر دیا۔

خدا تمھیں نیست و نابود کرے، تمھیں تباہ کرے، تم نے اپنوں کے ساتھ یہ سلوک کیا۔ فرزندِ رسولؐ

کو قتل کیا اور ان کا قتل باعثِ ثواب سمجھا، اسے اپنی آخرت کے لیے سرمایہ قرار دیا۔ کتنا پست وذلیل ہے تمھارا یہ خیال۔

بتاؤ! قیامت کے دن رسولِ مقبولؐ کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ کیا رسولؐ یہ نہ فرمائیں گے کہ ظالمو! تم نے ہماری عترت کو قتل کیا اور ہماری عزت و حرمت کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ جاؤ تمھارا شمار ہماری اُمت میں نہیں ہے"۔ [۱]

درحقیقت امام زین العابدینؑ طوق وسلاسل میں گرفتار، برہنہ پشت ناقہ پر سوار، دارالامارۃ کا راستہ طے کرتے ہوئے اہل کوفہ کو خطاب کرکے اپنی امامت کا اعلان فرما رہے ہیں اور تاریخ کے کانوں تک پیغامِ حسینی کے پہنچانے اور ظالم حکومت کی پھیلائی ہوئی غلط فہمی کو دُور کرنے کا کام شروع کر رہے ہیں۔ اور واقعاً اس وقت آپؑ کا یہ جہاد انتہائی نقطۂ عروج پر تھا۔ بالآخر وہ پیغام جو پشتِ ناقہ پر بیٹھ کر اس گرفتارِ طوق وسلاسل نے دیا، اس نے ابتدا ہی سے اپنا اثر دکھایا اور جب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ یہ اولادِ رسولؐ ہیں جن پر غیر مسلم ہونے کا اتہام لگا کر قید کیا گیا ہے تو سب حیرت میں پڑ گئے کہ آخر یہ حکومت ایسا غلط الزام اور یہ اتہام ان بے گناہوں پر کیوں لگا رہی ہے۔ اور یہ عمالِ حکومت یہ کیا طریقہ اختیار کیے ہوئے ہیں؟

لوگوں کے پتھر دل پگھلنے لگے۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور چہرے پر ندامت

۱؎ منبع قبل صفحہ ۱۸۹ اور بعض مورخین کے مطابق اس خطبہ کا کچھ حصہ اہلبیت کے کوفہ میں داخلہ کے بعد ارشاد ہوا تھا۔

کے آثار نمایاں تھے۔ اہلِ کوفہ انھیں اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوفہ کے سابق فرمانروا اور اسلام کے حقیقی خلیفہ حضرت امیرالمومنینؑ کا خطبہ سن رہے ہوں کہ اتنے میں امیرالمومنینؑ کی دختر رسن بستہ نے اپنے ناقہ سے انھیں ڈانٹ کر کہا:

شہزادی زینبؑ کا اہلِ کوفہ سے خطاب

"اے اہلِ کوفہ! اے فریب کارو، اے مکارو، اے غدّارو!!!
اب تم ہم لوگوں کی بربادی اور مظلومی پر آنسو بہاتے ہو اور آہ و زاری کرتے ہو۔
خوب روؤ، اللہ تمھیں ہمیشہ رونا نصیب کرے۔
اب تم آہ و زاری کرتے ہو۔ اچھا ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ تم تاابد آہ و زاری کرتے رہو۔
تم اس سوت کاتنے والے کے مانند ہو کہ جس نے سوت کات کر تیار کیا اور پھر اسے خود ہی کھول ڈالا۔
تم نے عہد و پیمان کیا، رشتۂ اسلام میں منسلک ہوئے اور پھر اپنے عہد کو توڑ کر اپنے پچھلے کفر کی طرف پلٹ گئے۔
افسوس! تم لوگ کتنے بُرے انسان ہو۔
تمھیں سوائے لاف زنی اور خودستائی کے اور کچھ نہیں آتا۔ تم لوگ مجسم مکر و فریب ہو، تم دشمن کے آدمی ہو، جھوٹے ہو۔ تم کنیزوں کی

طرح تملق اور چاپلوسی کرتے ہو اور دشمنوں کی طرح غمازی کرتے اور دھوکہ دیتے ہو۔
کیا تم لوگ انسان ہو۔ کیا تمھیں انسان کہا جا سکتا ہے؟
نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔ تم لوگ اس گھاس کی کی مانند ہو جو کسی مزبلہ پر اُگی ہو، جو بظاہر دوسری جگہ کی گھاسوں کے مانند ہری بھری ضرور ہے مگر اس کے رگ و ریشے، اس کا خمیر گندی اور پلید مٹی سے ہے۔ دیکھنے میں لہلہاتی ہوئی دل کش و دلفریب، مگر اس کی غذا، اس کی نشوونما وہی مزبلہ کی گندی اور ناپاک مٹی ہے۔
یا تم اس طلا و نقرہ کے مانند ہو جو کسی مقبرے پر چڑھا ہوا ہو۔
افسوس! تم لوگوں نے اپنے لیے انتہائی بُرا توشۂ آخرت فراہم کیا۔ تم نے قہرِ الٰہی مول لیا اور ہمیشہ کے لیے آتشِ جہنم فراہم کر لی۔
افسوس! خاندانِ رسالت کے پھولوں کو تم لوگوں نے ذبح کر کے ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ آلِ محمدؐ کو تہہ تیغ کر ڈالا۔
اور اب ہم پر آنسو بہاتے ہو اور ہائے ہائے کرتے ہو۔

ہاں خوب روؤ ، خوب ہائے ہائے کرو کہ دنیا میں سب سے زیادہ رونے کے مستحق تمھیں لوگ ہو۔ تم لوگوں نے ایسی ابدی رسوائی اور ذلّت کا دھبہ اپنے دامن پر لگایا جسے نہ کسی پانی سے دھویا جا سکتا ہے اور نہ کسی اور چیز سے چھڑایا جا سکتا ہے۔

تمھیں معلوم ہے کہ تم نے اپنے ناپاک ہاتھوں سے کس کو قتل کیا اور کس مایۂ ناز ہستی کا خون بہایا ہے ؟

وہ حسینؑ تھا ، حسینؑ ابن علیؑ ، فرزندِ فاطمہؑ ، جگر گوشۂ رسولؐ ، سید و سردارِ جوانانِ اہلِ جنّت ۔

تمھارا یہ گناہ ، اتنے بڑے گناہ کو کیسے مٹایا جا سکتا ہے ، اس ننگ و عار کو کس پانی سے دھویا جا سکتا ہے ؟

وہ نیکوکاروں کی پناہ تھا ، تمھارا امام اور پیشوا تھا ، وہ وہی حسینؑ تھا کہ ہر مصیبت کے وقت تم لوگ اس کو پکارتے اور اس کی پناہ میں آجاتے تھے ، وہ تمھارا معلّم تھا ، اس سے تم دین سیکھتے اور احکامِ شریعت کی تعلیم حاصل کرتے تھے ۔

افسوس ! تم لوگ کتنے بڑے گناہ کے مرتکب ہوئے اور تم نے آخرت کے لیے کتنا بُرا ذخیرہ فراہم کیا۔

اللہ تمھیں موت دے ، اللہ تمھیں ہلاک کرے ۔ اے اہلِ کوفہ ! اے غدارو ! تمھیں ہمیشہ حسرت و مایوسی نصیب ہو ۔ اے مکّارو ! اے فریبیو ! تم ہمیشہ نامراد رہو ، اے حسینؑ کے قاتلو !

تم پر وائے ہو .....

تم پر اللہ کا غضب نازل ہو ، تم ہمیشہ ذلّت و فلاکت میں مبتلا رہو۔

تمھیں احساس ہے کہ تم نے کیا کیا ؟ تم نے رسولؐ کے دل کے ٹکڑے کر دیے ۔

تمھیں اندازہ ہے کہ تم نے کیسے مقدّس اور پاک خون کو سرزمینِ کربلا میں بہایا ؟

تمھیں خیال ہے کہ تم نے کس گھر کے پردہ نشینوں کو پردہ سے باہر نکالا ؟

افسوس تم لوگ ایک عظیم حادثے اور سانحے کے مرتکب ہوئے ۔ ایسا سانحہ کہ جس کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑے اور زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے ۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں ۔

تمھارے گناہوں کی تاریکی زمین و آسمان پر چھا گئی ہے ۔

کیا تمھیں تعجب ہے ؟ تعجب نہ کرو ۔ اس گناہ

ہاں خوب روؤ ، خوب ہائے ہائے کرو کہ دنیا
میں سب سے زیادہ رونے کے مستحق تمھیں لوگ ہو۔
تم لوگوں نے ایسی ابدی رسوائی اور ذلت کا دھبہ
اپنے دامن پر لگایا جسے نہ کسی پانی سے دھویا
جا سکتا ہے اور نہ کسی اور چیز سے چھڑایا جا
سکتا ہے۔
تمھیں معلوم ہے کہ تم نے اپنے ناپاک ہاتھوں سے
کس کو قتل کیا اور کس مایۂ ناز ہستی کا خون
بہایا ہے ؟
وہ حسینؑ تھا ، حسینؑ ابن علیؑ ، فرزندِ فاطمہؑ ، جگر
گوشۂ رسولؐ ، سید و سردارِ جوانانِ اہلِ جنّت ۔
تمھارا یہ گناہ ، اتنے بڑے گناہ کو کیسے مٹایا جا
سکتا ہے ، اس ننگ و عار کو کس پانی سے دھویا
جا سکتا ہے ؟
وہ نیکوکاروں کی پناہ تھا ، تمھارا امام اور پیشوا
تھا ، وہ وہی حسینؑ تھا کہ ہر مصیبت کے وقت
تم لوگ اس کو پکارتے اور اس کی پناہ میں آجاتے
تھے ، وہ تمھارا معلّم تھا ، اس سے تم دین سیکھتے اور
احکامِ شریعت کی تعلیم حاصل کرتے تھے ۔
افسوس ! تم لوگ کتنے بڑے گناہ کے مرتکب ہوئے
اور تم نے آخرت کے لیے کتنا بڑا ذخیرہ فراہم کیا۔

اللہ تمھیں موت دے ، اللہ تمھیں ہلاک کرے ۔
اے اہلِ کوفہ ! اے غدارو ! تمھیں ہمیشہ حسرت و
مایوسی نصیب ہو۔ اے مکّارو ! اے فریبیو! تم
ہمیشہ نامراد رہو ، اے حسینؑ کے قاتلو !
تم پر وائے ہو.....
تم پر اللہ کا غضب نازل ہو ، تم ہمیشہ ذلت و
فلاکت میں مبتلا رہو۔
تمھیں احساس ہے کہ تم نے کیا کیا ؟ تم نے رسولؐ
کے دل کے ٹکڑے کر دیے ۔
تمھیں اندازہ ہے کہ تم نے کیسے مقدّس اور پاک خون
کو سرزمینِ کربلا میں بہایا ؟
تمھیں خیال ہے کہ تم نے کس گھر کے پردہ نشینوں
کو پردہ سے باہر نکالا ؟
افسوس تم لوگ ایک عظیم حادثے اور سانحے کے
مرتکب ہوئے ۔ ایسا سانحہ کہ جس کی اہمیت کو دیکھتے
ہوئے قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑے اور زمین
ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے ۔ پہاڑ ریزہ ریزہ
ہو جائیں ۔
تمھارے گناہوں کی تاریکی زمین و آسمان پر
چھا گئی ہے ۔
کیا تمھیں تعجب ہے ؟ تعجب نہ کرو۔ اس گناہ

کی وجہ سے تو آسمان سے خون کی بارش ہوئی ہے۔
اچھا اب تم لوگ انتظار کرو، اس ابدی سزا اور آخرت کے ہولناک عذاب کا جو خود تمھارا انتظار کر رہا ہے اور وہ عذاب اس عذاب سے زیادہ رسوا کن و دردناک ہوگا جس میں تم لوگ اس دنیا میں مبتلا ہو گے۔
تم لوگ اس دو روزہ مہلت پر خوش دل اور مغرور نہ ہو جاؤ۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دینے میں جلدی نہیں کرتا۔ اس کو اس کا خوف نہیں کہ انتقام اور بدلے کا وقت نکل جائے گا یا مجرم کہیں بھاگ جائے گا اور سزا سے بچ جائے گا۔
اللہ تعالیٰ مجرموں کی تاک میں ہے۔ وہ لوگ اس کے حدودِ اقتدار سے نکل کر کہاں جائیں گے؟[1]

شہزادی زینبؑ کے اس خطاب نے پورے شہر کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ان کے کانوں سے غفلت کے پردے اٹھ گئے۔ راوی کا بیان ہے کہ خدا کی قسم میں نے اس روز لوگوں کو دیکھا کہ بے ساختہ دھاڑیں مار کر رو رہے تھے اور اپنے کرتوت پر مارے افسوس کے اپنے دانتوں سے اپنے ہاتھ کاٹ رہے تھے۔ اس ہجوم میں میں نے ایک ضعیف العمر شخص کو دیکھا جو میرے

---

[1] منقول از کتاب "القباے فکری امام حسینؑ" ڈاکٹر محمد رضا صالحی کرمانی صفحہ ۲۴۳
نیز دیکھیے کتاب "اللہوف علی قتلی الطفوف" ابن طاؤس ترجمہ احمد زنجانی صفحہ ۱۴۶

پہلو میں کھڑا تھا۔ وہ اتنا رو رہا تھا کہ اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو رہی تھی اور کہہ رہا تھا:

"تم لوگوں پر میرے ماں باپ قربان، واقعاً تمھارے بزرگ تمام بزرگوں سے بہتر، تمھارے جوان تمام جوانوں سے بہتر، تمھاری عورتیں تمام عورتوں سے بہتر، تمھاری نسل تمام نسلوں سے بہتر ہے۔ یہ نہ ذلیل ہو سکتی ہے اور نہ کسی سے شکست کھا سکتی ہے"[1]

تاریخ شاہد ہے کہ اس وقت سے کوفہ کے کوچہ و بازار میں ایسا انقلاب پیدا ہوا جس کا اثر برسوں رہا اور مدت تک یہ شہر شورشوں میں مبتلا رہا اور اسے سکون وچین نصیب نہ ہوا۔

دربارِ ابنِ زیاد

اِدھر شہزادی کے اس خطبے نے اہلِ کوفہ کے افکار میں تبدیلی پیدا کردی اور اُدھر حاکمِ کوفہ اپنی فتحیابی پر مست وشاداں دارالامارۃ میں بیٹھا ہوا خاندانِ رسالت کے قیدیوں کے آنے کا انتظار کر رہا ہے۔ دربار آراستہ ہے، خوشامدی لوگ اس کے دسترخوان پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ ان سے لاف زنی کر رہا ہے کہ اتنے میں اسیران کربلا پیش کیے گئے۔ اس نے ایک نظر ان اسیروں پر ڈالی اور پھر انتہائی بے حیائی اور قساوتِ قلبی سے حکم دیا کہ عاشور کے شہیدوں کے سر بھی پیش کیے جائیں۔ وہ چاہتا تھا کہ امامؑ کے سرِ مقدس سے بے ادبی کر کے ان اسیروں کے دلوں پر اور چھری چلائے۔

---

[1] اللہوف علی قتلی الطفوف، ابن طاؤس۔ ترجمہ احمد زنجانی صفحہ ۱۴۸

مگر غور کیجیے کہ وہ بزدل ایسا کیوں کر رہا ہے؟
شاید وہ یہ چاہتا ہے کہ امامِ مظلومؑ سے انکارِ بیعت کا دوبارہ انتقام لے، وہ چاہتا ہے کہ جو سر زندگی بھر حکومت کے سامنے نہیں جھکا [illegible] اپنے سامنے پڑا ہوا دیکھے۔ یا شاید ظالم کوفہ سرِ امامؑ کے ساتھ بے ادبی کرکے یہ چاہتا ہے کہ امامؑ کی توہین کرے۔ مگر اب اس کے لیے یہ ممکن نہیں۔ امامؑ نے شہادت قبول کرکے اس کو ذلیل کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ہاں یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے شہداء کے سر اس لیے منگوائے ہوں کہ ان اسیروں کے سردار کا سر ان کے سامنے رکھ دیا جائے کہ شاید اس طرح ان اسیروں کے چہروں پر احساسِ ذلّت کے اثرات نظر آئیں۔ مگر یہ اس کی کس قدر خام خیالی ہے اور اسی خیال میں اس نے نگاہ اٹھائی مگر دیکھا کہ امام زین العابدینؑ اور شہزادی زینبؑ دونوں بالکل ثابت قدم کھڑے ہیں۔ ان میں کوئی جھکاؤ کوئی ضعف کوئی کمزوری نظر نہیں آتی۔ اب اس نے انتہائی بے ہودگی کے ساتھ قتلِ حسینؑ پر اللہ کا شکر ادا کرکے آلِ محمدؐ کو رسوا کرنا چاہا چنانچہ اس نے حضرت زینبؑ سے خطاب کرکے کہا۔

"اس خدا کا شکر کہ جس نے تم لوگوں کو ذلیل کیا اور تمھیں قتل کرکے تمھارے دعویٰ کی تکذیب کر دی۔"

اگر وہ یہ نہ کہتا اور خاموش رہتا تو اچھا تھا اور اس کے لیے خاموشی کا ایک بہانہ بھی تھا۔ اس لیے کہ اس مجمع میں بنی امیہ کے ایسے ایسے ارکین موجود تھے جو مکر و فریب میں کسی طرح معاویہ سے کم نہ تھے۔ انھیں موقع دیتا کہ وہ کچھ بولیں اور یہ ناممکن تھا کہ ایسے موقع پر وہ بغیر کچھ کہے رہتے۔ مگر

ابنِ زیاد سے نہ رہا گیا۔ بات یہ ہے کہ ہر شخص کی کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ ابنِ زیاد اپنی کامیابی اور فتحیابی کے نشہ میں ایسا چور تھا کہ خاموش نہ رہ سکتا تھا۔ اچھا اگر وہ خاموش نہیں رہ سکتا تو کربلا کی شیر دل خاتون کا جواب اس کو خاموش کر دے گا۔ حضرت زینب کبریٰؑ اس کو لاجواب کر دیں گی۔ آپ فرماتی ہیں:

"اس خدا کا شکر کہ جس نے تیرے قول کے برخلاف ہم لوگوں کو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت سے عزت و حرمت عطا فرمائی اور ہمیں طہارت و پاکیزگی کے درجۂ کمال تک پہنچایا۔ اور یاد رکھ کہ فاسق ہمیشہ رسوا ہوا کرتا ہے اور بدکار کی سدا تکذیب کی جاتی ہے۔"

دخترِ فاطمہ زہراؑ اپنے اس فقرے سے ابن زیاد کو متوجہ کر رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ دوغلوں، کمینوں، فاسقوں اور منافقوں کو ذلت و حقارت میں مبتلا کرتا ہے نہ کہ راست کردار اور پاک سیرت لوگوں کو۔ وہ حاکمِ کوفہ کو آگاہ کر رہی ہیں کہ اسیر اور بستۂ زنجیر ہونا نہ باعث ذلّت ہے اور نہ تختِ حکومت پر بیٹھنا کوئی دلیل پاکبازی ہے۔

یہ سُن کر حاکمِ کوفہ جھنجھلا اٹھا اور اس نے ایک دوسرے سخت فقرے کا سہارا لیا اور بولا:

"تم نے دیکھا کہ اللہ نے تمھارے خاندان کے ساتھ کیا کیا؟"

حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے فوراً جواب دیا اور بتایا کہ اللہ نے

ان کے خاندان کے ساتھ کیا کیا اور ظالموں کے ساتھ کیا کرنے والا ہے آپ نے فرمایا :

"اے ابنِ زیاد ! ان لوگوں کے مقدر میں شہادت تو کاتبِ تقدیر نے پہلے ہی سے لکھ دی تھی۔ وہ شہید ہوگئے اور اب جہاں ہیں بہت آرام سے ہیں اور خدا تجھے بھی وہاں جلد پہنچانے والا ہے تاکہ وہ لوگ تیری موجودگی میں اپنا مقدمہ بارگاہِ الٰہی میں پیش کریں اور اپنی بے گناہی ثابت کریں اور اس احکم الحاکمین سے انصاف کے طالب ہوں"

یہ جواب سُن کر اس حاکم ستم پیشہ کو اور طیش آیا۔ اس نے چاہا کہ وہ فاطمہ زہراؑ کی بیٹی کے تلوار سے زیادہ کاٹ کرنے والے ان فقرات سے خود کو نجات دلائے۔ وہ چاہتا ہے کہ حق کھُل کر سامنے نہ آئے اور گفتگو آگے نہ بڑھے، اس لیے فوراً حکم دیا کہ شہید کربلا کے اسیر و رسن بستہ فرزند امام زین العابدینؑ کو قتل کر دیا جائے۔

لیکن کیا اب اس کے اس حکم کا اجرا ممکن تھا ؟ ہرگز نہیں حضرت زینبؑ کے پرخوف و سہم انگیز مگر طوفان خیز کلمات نے اہلِ دربار کا رنگ بدل دیا تھا اور ان کلمات کے ساتھ رسولؐ کی نواسی کی دربار میں رسن بستہ موجودگی، انقلاب برپا کرنے کے لیے کافی تھی۔

حضرت زینبؑ چونکہ مولائے متقیانؑ کے خاندان کے سارے مَردوں کو ہاتھ سے کھو چکی تھیں اس لیے چلّا اٹھیں :

"کیا تم لوگ اب ہمارے بھائی کی اس نشانی کو بھی

مٹانا چاہتے ہو کہ ان کی کوئی یادگار باقی نہ رہے۔ مگر اے ابنِ زیاد! اے ظلم و ستم کی اولاد! سُن۔ تو سب کو قتل کر چکا مگر اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ جب تک زینبؑ کی جان میں جان ہے، جب تک زینبؑ زندہ ہے، ناممکن ہے کہ تو اپنی اس آرزو کو پورا کر سکے"

یہ کہہ کر آپ اپنے بھتیجے سے لپٹ گئیں، ان کے لیے سپر بن گئیں اور بولیں :

"اے ابنِ زیاد! خدا کی قسم میں اپنے بھتیجے کو نہ چھوڑوں گی، اسے قتل کرنا ہے تو پہلے مجھے قتل کر"

اب یہ ابنِ زیاد پر راست ضرب تھی۔ ایک وہ شخص جس کو اپنی طاقت و اقتدار پر حد درجہ گھمنڈ تھا، اب ایک عورت، ایک شیر دل عورت نے طاقت کے بلند دعوے سے اُتار دیا اور وہ سست پڑ گیا۔

اور ابھی اس گفتگو کا اثر اہلِ دربار کے دلوں سے محو نہیں ہوا تھا کہ ایک دوسرے فقرے نے اس کے سارے تکبّر اور گھمنڈ کو خاک میں ملا دیا اور وہ فقرہ تھا حضرت امام زین العابدینؑ کا۔ آپ حکمِ قتل سُننے کے بعد بلاخوفِ مرگ صاف الفاظ میں ابنِ زیاد سے مخاطب ہوئے :

"تو مجھے قتل سے ڈراتا ہے؟ تجھے نہیں معلوم کہ قتل ہونا تو ہماری میراث ہے اور شہادت تو ہمارے

لیے باعثِ شرف ہے۔"

ایک جرائتمند باپ کے جرائت مند بیٹے نے انتہائی جرائتمندانہ طور سے خود کو شہادت کے لیے پیش کر دیا اور حیرت ہے کہ اس نے قتل و شہادت کو اپنے خاندان کی میراث اور اپنے لیے باعثِ شرف سمجھا۔ گویا کربلا کے شہدا کی رجز خوانیاں پھر سے زندہ ہوگئیں اور شجاعت کے ساز پھر سے چھڑ گئے۔

اس مقابلہ کے ابتدا ہی میں دشمن کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ سچ ہے تختِ حکومت پر بیٹھا ہوا امیر بھلا ایسی فوج کا کیا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اب اس کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ اپنے حکم کو واپس لے لے۔ کیا یہ ممکن تھا کہ ان اسیروں، بیواؤں اور یتیموں کے قافلے کے ساتھ جو ایک زنجیروں میں جکڑا ہوا مرد قیدی باقی رہ گیا ہے اسے بھی قتل کر دے۔ آخر لوگوں کا انصاف کیا کہے گا۔ ہر طرف سے اس کے اس حکم کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔

ظلم کے اس دربار میں ظالموں سے امام زین العابدینؑ کی جنگ کا پہلا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ رائے عامہ حکومت کے خلاف ہوگئی۔ یہ کربلا کے شہیدوں کے فلسفۂ جہاد و شہادت کی تبلیغ کی پہلی کامیابی تھی۔

لیکن ابن زیاد بھی ہار تسلیم کرنے اور اسلام کے سچے مبلغین کے مقابلہ میں شکست کی ذلت گوارا کرنے پر راضی نہ تھا۔ اس نے اپنی چھڑی اٹھائی اور امامؑ کے مقدس لب و دندان سے بے ادبی شروع کر دی اور ان اسیروں کو ہراساں اور مرعوب کرنے کے لیے طرح طرح کی حرکتیں کرنے لگا جس کا اثر ان اسیروں پر ہونے کے بجائے خود اس کے

خوف اور کمزوری کو ظاہر کرنے لگا۔

حضرت سید سجادؑ نے اس کی ان بیہودگیوں کو دیکھا اور یہ دیکھا کہ وہ ان لبوں سے بے ادبی کر رہا ہے جس پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بوسے دیا کرتے تھے، تو آپؑ سے نہ رہا گیا اور سر آسمان کی طرف بلند کرکے بولے:

"پروردگارا! مجھے دنیا سے اس وقت تک نہ اُٹھا جب تک میں یہ نہ دیکھ لوں کہ جس طرح یہ ظالم غذا زہر مار کر رہا تھا اور میرے باپ کا سر اس کے سامنے لایا گیا اسی طرح میں بھی کھانا کھاتا رہوں اور اس ظالم کا سر میرے سامنے لایا جائے۔"

ابن زیاد ان اسیروں کی ہمت وجرائت کو دیکھ کر پریشان تھا۔ حکم دیا کہ ان کو قید خانے میں لے جایا جائے۔ اور قید خانہ بھی کیسا۔ وہ صرف ایک کھنڈر تھا اور کچھ نہ تھا۔

اہل کوفہ کے تیور بدلے ہوئے تھے، افکار میں تبدیلی آرہی تھی۔ شہر کی فضا بدل رہی تھی۔ لوگوں کے چہروں پر انقلاب کے آثار نظر آرہے تھے ابن زیاد نے اس خیال سے کہ یہ ہیجان زیادہ پھیلنے نہ پائے حکم دیا کہ سب لوگ مسجد میں جمع ہوں۔ وہ چاہتا تھا کہ کربلا کی فتح کو اپنی حقانیت کی دلیل بنا کر پیش کرے اور لوگوں کو یہ بتائے کہ یہ اسیر خارجی اور مرتد ہو گئے تھے انھوں نے اسلام ترک کر دیا تھا لہٰذا ان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے وہ اسی کے مستحق تھے۔ درحقیقت وہ خود کو شکست سے بچانے کی کوشش کرنے لگا اور مجمع کے سامنے علیؑ اور اولادِ علیؑ پر سب وشتم کرنے لگا۔

لیکن کیا واقعاً وہ عوام کی بیداری سے واقف نہ تھا یا یہ کہ وہ اپنے اعلانات کے ذریعہ عوام کے دلوں میں بیداری کے اٹھتے ہوئے شعلوں کو بجھانا چاہتا تھا۔ مگر اس کا یہ حربہ بھی بیکار گیا۔ لوگوں نے خود اپنے کانوں سے سُنا کہ یہ قیدی کلام پاک کی تلاوت کر رہے ہیں اور رسولؐ کی رسالت کی گواہی دے رہے ہیں۔ پھر ایسی صورت میں ان پر ارتداد اور ترک اسلام کا الزام کیسے لگایا جا سکتا ہے۔ مجمع سے اس کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں، لوگوں نے اسے وہیں سخت و سست کہنا شروع کر دیا اور کہنے لگے۔

"او، دشمن خدا! ایک تو تُو نے فرزندِ رسولؐ کو قتل کیا اور اب اس کے متعلق جھوٹی باتیں بھی کرتا ہے۔ خدا تجھ پر لعنت کرے۔ اے پسرِ مرجانہ! تو انبیاء کی اولاد کا قاتل ہے اور باتیں صدیقوں جیسی کرتا ہے۔ اب ہم تیری بات نہ مانیں گے۔"[1]

دمشق کو روانگی

یہ انقلاب کا ایک شعلہ تھا اور ظلم کے خلاف عوام کی آواز تھی جو مجمع سے بلند ہوئی اور جس نے حاکم شہر کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کسی طرح جلد از جلد انقلاب کے ان اثرات سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔ لہٰذا اس نے حکم دیا کہ اس حسینی قافلہ کو یزید کے دربار میں دمشق کی جانب بھیج دیا جائے۔

اس حکم کے صادر ہوتے ہی ان اسیروں، ان بیواؤں، ان یتیموں کو اونٹوں کی برہنہ پشت پر بٹھایا گیا اور امام زین العابدینؑ کے ہاتھوں میں ہتھکڑی، پیروں میں بیڑی اور گلے میں طوقِ خاردار پہنایا گیا اور اس طرح اسیروں کا یہ

---

[1] از عبداللہ بن عفیف۔

قافلہ منزل بہ منزل دمشق کی جانب روانہ ہوا اور راستہ بھر سید سجادؑ کا دردناک اور بیدار کرنے والا یہ کلام لوگوں کے کانوں تک پہنچتا رہا:

"میں ایک عظیم رہنما کا فرزند ہوں، ان بے دینوں اور کمینوں نے ہمارے حق کو غصب کر لیا۔"

"تعجب ہے کہ زمانہ نہ مردانِ بزرگ و عالی مرتبہ سے دستبردار ہوتا ہے اور نہ ان کے مصائب کو ختم ہوتے دیکھنا پسند کرتا ہے۔"

"کاش مجھے معلوم ہوتا کہ زمانہ ہم اہلبیت سے کب تک دست و گریباں رہے گا اور یہ کشمکش کب تک چلے گی۔"

"دنیا یہ ظلم دیکھ لے کہ ہم لوگوں کو شتران بے کجاوہ پر سوار کر کے دیار بہ دیار پھرایا جا رہا ہے۔"

"ہم لوگ تو اس طرح قید ہیں جیسے روم کی کنیزیں قید کر کے لائی جاتی ہیں۔"

"اے بدترین امت! وائے ہو تم پر۔ تم اللہ کے پیغمبر کے منکر ہو گئے اور ان کی سنت و طریقہ کے خلاف عمل کرنے لگے۔"[1]

اب قافلہ دمشق کے قریب پہنچتا ہے[2]۔ حکومت نے ان قیدیوں کے خلاف لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں۔ اس لیے وہاں کی سیاسی فضا ان قیدیوں کے بالکل خلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ لوگ اکثر حکومت کی طرف

---

[1] ناسخ التواریخ مجلد حضرت سجاد۔ جزو ۲ صفحہ ۱۶۴-۱۶۵

[2] مورخین نے اوّل ماہ صفر تحریر کیا ہے۔

—پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا شکار ہو ہی جاتے ہیں۔ انھیں اصل حقیقت کا علم نہیں ہوتا اور عوام کا تو یہ حال ہمیشہ ہی سے رہا ہے کہ ہر آواز پر کان اٹھا لیتے اور ہر آواز سے آواز ملا لیتے ہیں۔ اہلِ دمشق نے یہ سمجھا تھا کہ جو کچھ ان سے کہا گیا ہے وہ سب سچ ہے۔ اس لیے وہ بالکل تیار تھے کہ ان قیدیوں کو زخمی کریں یا کم از کم زبان ہی سے انھیں برا بھلا کہیں۔ دمشق میں ان قیدیوں کا جو استقبال ہوا وہ خود بتا رہا ہے کہ یہ سب کچھ حکومت کے سیاسی پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے۔

چنانچہ ایک شخص جس کا اندازِ گفتگو یہ بتا رہا تھا کہ وہ جنگِ جمل کا زخم خوردہ ہے لیکن سیاسی ہمت افزائیوں نے اسے اس درجہ گستاخ کر دیا کہ وہ ان قیدیوں کا مضحکہ اڑاتے ہوئے بولا:

"بتاؤ کون غالب ہوا؟"

صاحبانِ حکومت ہمیشہ یہی چاہتے رہے کہ پروپیگنڈے کے زور پر انتظامی فتح کو عقیدے کی فتح ثابت کریں اور یہ شخص بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ جنگ میں ظاہری شکست درحقیقت عقیدے کی شکست ہے۔

لہٰذا یہ موقع تھا کہ اسلام کی باتیں لوگوں کے کانوں تک پہنچائی جائیں اور ان کے افکار کو حق کی طرف دعوت دی جائے۔ اس بنا پر امام زین العابدینؑ نے بہترین انداز میں اس کو جواب دیا اور فرمایا:

"اگر تم واقعاً جاننا چاہتے ہو کہ غالب کون ہوا اور آخری فتح کس کی ہے تو ذرا ٹھہرو، ذرا صبر کرو، نماز کا وقت آجانے دو اور اذان کی آواز سنو۔ اذان کے کلمات تم کو خود بتا دیں گے کہ فتح کس کی ہے، کلمہ کس کا پڑھا

جا رہا ہے، نام کس کا بلند ہے اور غالب کون ہے۔"[۱]

معلوم ہوتا ہے کہ دمشق میں ان قیدیوں کا یہ دوسرا استقبال بھی ابن زیاد کے استقبال کے مانند ہی تھا۔ حاکمِ شام بھی یہی سمجھ رہا تھا اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کربلا کی شکست اور شام کی قید سے اس خاندان کی بیخ کنی ہو گئی۔ محمدؐ کی نسل کا خاتمہ ہو گیا۔ اسی لیے وہ بھی اللہ کا شکر ادا کرنے لگا کہ اس نے آلِ محمدؐ کو ہلاک کر دیا۔

بہرحال امام زین العابدینؑ نے اس شخص کے سامنے اپنی حقانیت اور اسلام کی صداقت ثابت کرنے کے لیے قرآن کی خاص اس آیت کو پیش کیا جسے آپؑ کے دشمن اپنی حقانیت کی دلیل بنا کر اہلِ شام کے سامنے پیش کیا کرتے تھے یعنی آپ نے اس آیت کا حوالہ دیا:

"اے محمدؐ ان مسلمانوں سے کہہ دو کہ میں تم لوگوں سے اپنی تبلیغ اور رسالت کی اجرت اور کچھ نہیں چاہتا بس صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم لوگ ہمارے ذوی القربیٰ سے محبت رکھو۔"

پھر دوسری آیت پڑھی:

"ہمارے ذوی القربیٰ کا حق ادا کرو۔"

اور آخر میں آیۂ تطہیر پیش کی:

"اے اہلِ بیتؑ! بس خدا یہ چاہتا ہے کہ تم لوگوں سے ہر طرح کی پلیدگی اور رجس کو دور رکھے اور تمھیں اتنا پاک رکھے جتنا پاک رکھنے کا حق ہے۔"

---

[۱] اس روایت کو دوسرے طریقے سے بھی لوگوں نے بیان کیا ہے۔

اس شماتت کرنے والے شخص کا دعویٰ تھا کہ اس نے ان آیات کی تلاوت قرآن مجید سے کی ہے تو آپؑ نے انہی آیات سے نہایت سادہ اور موثر انداز میں اپنا اور اپنے آباؤ اجداد اور اپنے خاندان کا دفاع کیا اور کہا :

"اے شخص وہ ذوی القربیٰ ہم ہی لوگ ہیں جن کی دوستی اور مودت کا حکم اللہ نے دیا ہے اور وہ اہلبیت ہم ہی لوگ ہیں جنھیں اللہ نے پاک اور مطہر رکھا ہے۔"

کیا کوئی ایسا مسلمان ہے جو ان صریحی آیات اور قطعی دلائل کو، جن کی کاٹ تلوار سے بھی زیادہ تیز ہے، سن کر خاموش نہ ہو جائے ؟ کیا اس کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ ان قیدیوں کے پیغمبرِ اسلام کے ذوی القربیٰ اور رشتہ دار ہونے سے انکار کر دے ؟ کیا اس کی یہ مجال ہے کہ وہ یہ کہے کہ یہ خدا کا حکم نہیں ہے ؟ اگر ایسا کہے گا تو وہ مسلمان نہیں رہے گا اور اپنے دین سے انکار کرے گا۔

لہٰذا اس شخص نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا، اللہ کی بارگاہ میں اپنے گناہوں سے توبہ کی، امامؑ کی شان میں جو گستاخیاں سرزد ہوئی تھیں اس کی معافی مانگی اور دشمنانِ آلِ محمدؐ اور قاتلانِ اہلبیتِ پیغمبرؐ سے برائت کا اظہار کیا۔

عوام کے افکار اور اذہان تو اسی طرح کے سیدھے سادے ہوتے ہیں کوئی ایسا ہو جو انھیں اپنی طرف متوجہ کرے۔ اگر بُرا ہے تو انھیں برائی کی طرف متوجہ کرے گا اور اچھا ہے تو اچھائی کی طرف۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ صرف حقانیت خود کو کسی سے نہیں منوا سکتی بلکہ کوئی شخص ہو جو اسے سمجھائے

ؔ ملاحظہ کیجیے کتاب "اللہوف علی قتلی الطفوف" ترجمہ فارسی صفحہ ۱۷۷

اور عوام سے منوائے۔

ان حالات سے گزرتے ہوئے اسیروں کا قافلہ شہرِ دمشق میں داخل ہوتا ہے۔ سرِ مقدس سیدالشہداءؑ آگے آگے ہے اور ہاتفِ غیبی ندا دیتا جا رہا ہے۔

"اے دخترِ رسولؐ کے فرزند ! یہ لوگ آپ کا خون بھرا ہوا سرِ مقدس لا رہے ہیں اور خوش ہیں۔ حالانکہ جس دن آپ قتل ہوئے اس دن سے زیادہ کوئی اور دن حسرت و افسوس و ندامت کا نہیں ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی لاش، اور شہداء کی لاشوں کے ساتھ میدان کربلا میں پڑی ہوئی ہے۔ فرزندِ رسولؐ آپ کا قتل یہ بتاتا ہے کہ یہ لوگ، اگر رسولؐ موجود ہوتے تو یقین ہے کہ انھیں بھی قتل کر دیتے۔ آپ کو قتل کرتے وقت یہ لوگ تکبیر کہتے جاتے تھے حالانکہ انھوں نے آپ کو قتل کر کے ذکرِ خدا اور تکبیر کے گلے پر چھری پھیر دی اور بنیادِ لا الٰہ کو ڈھا دیا۔"ؔ

قلبِ شہر میں حاکمِ وقت خلافتِ اسلامیہ کے حقیقی وارث کے قتل کی خوشی میں مست و بیخود تھا اور تیار بیٹھا تھا کہ ایک آخری وار اور کر کے شمعِ اسلام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گُل کر دے۔ اسے سردارانِ لشکر نے یہ خبر دی تھی کہ :

"ہم لوگ ان مقتولین کے مقابلہ کے لیے کربلا پہنچے اور ان سے کہا کہ وہ ابنِ زیاد کی اطاعت قبول کریں اور سرِ تسلیم

ؔ ناسخ التواریخ مجلد حضرت سجاد جزء ۲، صفحہ ۱۹۷

ختم کریں ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ ان لوگوں نے اطاعت پر جنگ کو ترجیح دی اور آفتابِ عاشور طلوع ہوتے ہی ہم لوگ ان پر حملہ آور ہوئے اور ہر چہار جانب سے انھیں گھیر لیا اور عصر تک سب کا خاتمہ کر دیا۔ اب ان کی لاشیں بے گور و کفن، ان کے لباس خون میں غلطاں اور ان کے جسم خاک آلود میدان میں پڑے ہوئے ہیں، جن پر دن کی دھوپ پڑتی ہے اور گرم ہوائیں چلتی ہیں"۔[1]

دربارِ یزید

یزید بدنہاد اپنے اراکینِ سلطنت اور زعمائے قوم کے ساتھ دربار سجائے ہوئے بیٹھا تھا اور درحقیقت فرزندِ رسولؐ کے قتل اور امام زین العابدینؑ کو اسیر کرکے اب اس کی جسارت اور بڑھ گئی ہے وہ چاہتا ہے کہ اب دینِ اسلام سے جنگ کرے، مگر اس جنگ میں تلوار کے استعمال کی ضرورت نہیں۔ اسلام کو مٹانے کے لیے ذمہ دارانِ اسلام یعنی آلِ محمدؐ کی بے حرمتی اور توہین کافی ہے۔ اور پھر تلوار کس لیے اٹھائیں۔ وہ قافلہ جو اسلام بچانے کے لیے چلا تھا وہ تو اب سبھی تہہ تیغ ہو چکا، صرف ایک مرد باقی ہے جو اپنے قافلہ کا ساربان ہے۔ اس کو آسانی سے نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ میدان کی جنگ تو ختم ہو چکی۔ اب تو صرف ایک مرد ہے جو بیمار و اسیر ہے اور ایک عورت ہے جو اپنے کنبہ کی سوگوار ہے۔ ان دونوں میں کیا ہمت

[1] تاریخ طبری

ہوگی جو ہمارے سامنے دم مار سکیں۔ وہ چاہتا تھا کہ کربلا کی فتح کو اپنے آباؤ اجداد کے نظامِ جاہلیت کی فتح اور اسلام کی شکست کے لیے دلیل بنائے اس لیے کہ آلِ محمدؐ کی شکست درحقیقت اسلام کی شکست ہے۔

شاید اسے معلوم نہ تھا کہ اسیروں کے اس قافلہ کو دیکھ کر عوام میں نیم بیداری پیدا ہو چکی ہے اس لیے وہ میدانِ جنگ کی شکست کو اسلام کے عقائد و نظریات کی شکست ثابت کرنا چاہتا ہے اور اس آرزو کی تکمیل میں ایسا لگتا ہے کہ سرِ مقدسِ حضرت سید الشہداءؑ اس کے سامنے زیرِ تخت ہے اور بھرے دربار میں ان کی عترت رسن بستہ کھڑی ہوئی ہے۔ وہ ان کی تکلیفوں کو نظر انداز کر کے امام زین العابدینؑ سے خطاب کرتا ہے:

"یہ دیکھو تمھارے باپ کے ساتھ اللہ نے کیا کیا؟"

وہ چاہتا تھا کہ اس راہِ حریت کے مجاہد نے انجام کو جانتے ہوئے جو اقدام کیا، وہ ان کی غلطی ثابت کرے اور یہ بتائے کہ انھوں نے بیعت سے انکار کرکے جرم کیا تھا اور اس جرم کی سزا میں اللہ نے انھیں قتل کر دیا۔

مگر اسے معلوم نہ تھا کہ کربلا کے اس گلگوں کفن شہید نے اللہ پر توکل کر کے اپنی زندگی کے لیے یہی راہ متعین کی تھی اور اپنے مقصد کو نمایاں کرنے کے لیے دلیرانہ موت قبول کی تھی۔ یہ قدم انھوں نے خوب سوچ سمجھ کر اٹھایا تھا غلطی سے نہیں۔

امام زین العابدینؑ نے جواب دیا:

"میں نے تو ان کے لیے بھی وہی حکمِ قضا دیکھا جو اللہ کی طرف سے آسمان و زمین سب پر جاری ہوتا ہے"۔

لیکن یزید میں غالباً مطلب سمجھنے کی صلاحیت نہ تھی اس لیے وہ جواب جو اسے دیا گیا اس کے دماغ میں نہیں سمایا اور دوبارہ توہین کے ارادے سے اس نے وہی بات اس طرح کہی:

"تم اسی کے تو فرزند ہو جس کو اللہ نے قتل کیا"

وہ اس قدر غفلت میں ڈوبا ہوا تھا کہ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اللہ نے انسانی فطرت کو صحیح راستے کی ہدایت کی ہے۔ اگر فرزندِ رسولؐ نے اللہ کی اطاعت میں موت قبول کی ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اللہ ہی نے ان کو قتل کیا۔ بلکہ ان کی شہادت ان پلید ہاتھوں سے ہوئی جو اپنی فطرت سے دُور اور سچائی سے روگرداں ہیں۔ اگر یہ فطری ہدایت اور سچائی پر قائم رہتے تو ممکن نہ تھا کہ ان کا ہاتھ ان راستبازوں کے خون سے رنگین ہو، یہ لوگ ظالم ہیں، پست فطرت ہیں، خدا ناشناس ہیں اور خدا شناسوں کو قتل و اسیر کیے ہوئے ہیں۔

امام زین العابدینؑ نے یزید کے روبرو اس کا جرم اور اس کی سزا دونوں کو قرآنی دلیل کے ساتھ انتہائی جراٴتمندی سے ان الفاظ میں پیش کیا:

"میں اس کا فرزند ہوں جس کو یزید نے عمداً قتل کیا اور قرآنِ مجید میں ہے کہ جو شخص کسی مردِ مومن کو عمداً قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ تا ابد رہے گا۔"

یزید اس فکر میں تھا کہ ان قید کی زنجیروں اور شہداء کے سروں کو اپنی حقانیت کی دلیل بنا کر اہلِ دربار کے سامنے پیش کرے اور اگر کوئی اسیر کچھ بولے تو اس کے دلائل کی کڑیوں کو اپنی قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان سے کاٹ

دے۔ بلکہ ابتدا میں تو اس کا یہ خیال تھا کہ جب یہ کربلا کے قیدی رسن بستہ ہو کر ہمارے دربار میں پیش ہوں گے تو نہایت خوفزدہ، لرزتے ہوئے انتہائی عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑے ہوں گے، مگر یہاں تو معاملہ ہی برعکس ہے۔ یہ بیمار اور اسیر تو شیروں کی طرح دھاڑ رہا ہے اور بالکل مرعوب نہیں ہے اور اس کی ہمت و جراٴت و بےباکی بتا رہی ہے کہ حق پر کون ہے۔

اس نے امام زین العابدینؑ کے قتل کا حکم دے دیا اور اس وقت تو اس کا غصہ اور تیز ہو گیا جب امام زین العابدینؑ نے اس کے اس حکمِ قتل کے جواب میں فرمایا:

"آزاد شدہ غلام کی اولاد کی یہ ہمت کہ انبیاء کی اولاد کے قتل کا حکم صادر کرے۔ اگر ایسا ہے تو میں بھی اس کے لیے تیار ہوں مگر تو یہ چاہے کہ تیری طاقت اور تیری کذب بیانی کے آگے سرِ تسلیم خم کر لوں تو یہ ممکن نہیں"

یہ کہہ کر امام زین العابدینؑ نے فرمایا:

"اچھا اگر تیرا یہی ارادہ ہے کہ محمدؐ کی نسل کو بالکل ختم کر دے تو میں تیار ہوں۔ جلّاد کو بلالے مگر اس سے پہلے کسی قابلِ اعتماد شخص کو میرے پاس بھیج دے تاکہ میں اس سے کچھ وصیت کر لوں اور ان بیواؤں اور یتیموں کو اس کے سپرد کر دوں"

یہ کہہ کر امام زین العابدینؑ اُٹھے تاکہ عالمِ بشریت کی رہنمائی کے لیے موت کو قبول کریں۔ یہ دیکھ کر اہلِ دربار کو تابِ ضبط نہ رہا۔ ساری فضا بدل گئی، ہر طرف سے آواز آنے لگی:

"اے یزید! ان اسیروں کے قافلے میں تو یہی تنہا ایک مرد بچ گیا ہے کیا تو اسے بھی قتل کر دے گا۔ یہ تو کوئی بہادری کی بات نہیں ہے۔ پھر یہ سوچ کہ ان بیواؤں اور یتیموں کی سرپرستی کون کرے گا۔"

ہر طرف سے مخالفت کی آوازوں نے یزید کو اپنی غلطی کی طرف متوجہ کیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس حکمِ قتل کو سُنکر اسیروں پر خوف طاری ہو جائے گا، ان کے چہروں پر ذلت اور شکستگی کے آثار نمایاں ہوں گے اور اہلِ دربار کے دلوں پر ہمارا رعب کا سکّہ بیٹھ جائے گا مگر دربار کا یہ رنگ دیکھ کر تو اب اس کو اپنے اقتدار کی فکر لاحق ہو گئی۔

سیّدِ سجادؑ کا اہلِ دربار سے خطاب

امام زین العابدینؑ اہلِ دربار کی طرف رُخ کر کے گویا ہوئے:

"مسلمانو! یہ بتاؤ کہ جب قیامت کے دن پیغمبرِ اسلامؐ تم لوگوں سے سوال کریں گے کہ بولو میری رحلت کے بعد تم لوگوں نے میرے خاندان اور میری عترت کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ یہی تو کہ کچھ کو اسیر کیا اور کچھ کو قتل کیا اس وقت تم لوگوں کے پاس کیا جواب ہوگا؟" [۱]

۱؎ ناسخ التواریخ مجلد حضرت سجاد جزو ۲ صفحہ ۱۹۶ اور اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت رسولِ اکرمؐ سے منقول ہے کہ آپ اپنی امّت کے ایک گروہ سے سوال کریں گے کہ بتاؤ میرے بعد تم لوگوں نے میری عترت اور کتابِ خدا کے ساتھ کیا سلوک کیا

باقی صفحہ ۸۵ پر

اہلِ دربار کی آنکھوں میں آنسو تھے اور یزید کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اب وہ سخت دلدل میں پھنسا ہوا تھا لہٰذا مزید فضیحت و رسوائی سے بچنے کے لیے حکمِ قتل واپس لے لیا اور اہلِ دربار کو دکھانے کے لیے ان اسیروں کے حال پر اظہار کرنے لگا۔ مگر دل میں یہ تھا کہ جب موقع ملے اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنائے۔

اور اب واقعاً وہ ان راہِ حق کے مجاہدوں کے مقابلہ میں اپنا حکم واپس لینے پر مجبور تھا اور پھر اسی دربار میں ثانی زہرا حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے پُرغیظ و غضب خطبہ نے تو یزید کی پشت پر تازیانہ کا کام کیا۔ یزید کو مخاطب کر کے آپ نے فرمایا:

شہزادی زینبؑ کا خطبہ

"اے یزید! کیا تیرا یہ خیال ہے کہ ہم اہلِ بیت پر زمین و آسمان تنگ کر کے ہم لوگوں کو اسیر اور شہر بشہر پھرا کر تو نے ہماری منزلت کو گھٹا دیا اور اپنے وقار و عزّت کو بڑھا لیا اور تقربِ الٰہی حاصل کر لیا اور اسی بنا پر تو تکبّر و غرور کی باتیں کر رہا ہے اور

تو وہ سب جواب دیں گے، یا حضرتؐ ہم نے اللہ کی کتاب کو ضائع کر دیا ہے اور کوشش کی ہے کہ آپ کی عترت کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ پیغمبرِ اکرمؐ فرماتے ہیں کہ اس وقت میں ان کی طرف سے منہ پھیر لوں گا اور وہ لوگ پیاسے و دل سوختہ ہمارے پاس سے واپس چلے جائیں گے۔ ملاحظہ کیجیے کتاب اللہوف علی قتلی الطفوف ترجمہ احمد زنجانی۔ صفحہ ۱۹

خوش ہے کہ اب ساری دنیا کی حکومت تیرے پاس ہے اور راستہ صاف ہو گیا ہے اور کوئی مزاحمت کرنے والا نہیں رہ گیا۔

اے یزید! اپنی باگ روک، اپنے آپے میں رہ، شاید تو بھول گیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"ان کفر اختیار کرنے والوں کو ہرگز یہ گمان نہ کرنا چاہیئے کہ ہماری دی ہوئی مہلت ان کے لیے بہتر ہے ان کو تو مہلت اس لیے دی گئی ہے کہ وہ اپنے گناہوں میں اور اضافہ کرلیں تاکہ ان کی سزا میں اضافہ ہو اور دردناک سے دردناک تر عذاب تو ان کے لیے طے ہے"

اے آزاد کردۂ رسولؐ کی اولاد! کیا یہی انصاف ہے کہ تو نے اپنی عورتوں اور کنیزوں کو تو پردہ میں بٹھا رکھا ہے اور رسولؐ کی نواسیوں کو اسیر و رسن بستہ شہر بہ شہر پھرایا، ان کی بے حرمتی کی، ان کو پردے سے باہر نکالا اور ایک دشمن فوج کی نگرانی میں دیار بہ دیار پھرایا اور ان پر ہر نزدیک و دُور اور ہر شریف و رذیل کی نگاہیں پڑیں۔

مگر واقعاً اس کے علاوہ اور کیا امید کی جا سکتی ہے اس شخص سے جس کے بزرگوں نے ہمارے بزرگوں کے جگر چبائے ہوں مگر اسے ہضم نہ کر سکے ہوں اور پھر منہ سے اُگل دیا ہو۔ جس کا گوشت و پوست ہمارے شہیدوں کے خون سے نشو و نما پایا ہو، اس سے ہم

بھلائی کی کیا امید رکھیں۔ بھلا وہ شخص ہم اہلبیتؑ سے دشمنی نکالنے میں کیوں دیر کرتا جس کے دل میں روزِ بدر اور روزِ اُحد سے ہی ہم لوگوں کی عداوت پل رہی ہے۔ جو ہم لوگوں کو ہمیشہ دشمنی کی نظر سے دیکھتا رہا۔

افسوس! بجائے اس کے کہ تو اپنے جرم کا احساس کرتا اور قتلِ حسینؑ کو عظیم ترین گناہ تصور کرتا تو یہ شعر پڑھ رہا ہے:

لَاَهَلُّوْا وَاسْتَهَلُّوْا فَرَحًا ثُمَّ قَالُوْا يَا يَزِيْدُ لَا تُشَلْ

(ترجمہ) کاش بدر میں قتل ہونے والے ہمارے بزرگ آج ہوتے اور دیکھتے کہ ہم نے ان کا کیسا بدلہ لیا تو وہ خوش ہو جاتے اور ہمیں شاباش کہتے کہ اے یزید اللہ ہمیشہ تیرے ہاتھ سلامت رکھے وہ کبھی شل نہ ہوں"

اور اسی کے ساتھ ساتھ اپنے ہاتھ کی چھڑی سے سردارِ جوانانِ اہلِ جنت ابو عبداللہ الحسینؑ کے لب و دندان سے بے ادبی بھی کرتا جا رہا ہے۔

اور سچ ہے آج تو ایسے اشعار کیوں نہ پڑھے تو نے تو ہم اہلِ بیت کے کلیجے پھاڑ دیئے، ہم لوگوں کی جڑ کاٹ دی، ذرّیتِ رسولؐ کا خون بہایا اور اولادِ عبدالمطلبؓ کے ستاروں کو کربلا کی زمین پر بکھیر دیا۔ اس کے بعد اپنے مرے ہوئے بزرگوں کو آواز دے رہا ہے اور تیرا خیال ہے

کہ وہ تیری آواز کو سُن رہے ہیں ؟

خیر وہ دن قریب ہے کہ تو اپنے بزرگوں سے ملحق ہوگا اور اس وقت تو خود کہے گا کہ کاش ہمارے ہاتھ شل ہو گئے ہوتے' (اور میں قتل حسینؑ جیسا عظیم گناہ نہ کیے ہوتا) کاش میری زبان گنگ ہوگئی ہوتی اور میں اپنی زبان سے ایسے اشعار نہ پڑھے ہوتا مگر اس وقت تیری یہ تمنا بے سود ہوگی۔

اے یزید! سُن، تو نے (حسینؑ کو قتل کرکے) خود اپنی کھال کھینچی ہے، اپنے کو ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے کیونکہ وہ وقت قریب ہے جب تو ذریت رسولؐ کے قتل اور ان کی عترت کی ہتکِ حرمت کے گناہوں کا بوجھ اپنے سر پر لادے ہوئے رسولؐ کے سامنے آئے گا۔

اور اللہ تعالیٰ وہاں آلِ محمدؐ کو بھی یکجا کرے گا اور ان کی فریاد کو سُنے گا اور یہ خیال نہ کر کہ وہ لوگ جو راہِ خدا میں شہید ہوگئے وہ مردہ ہیں۔ درحقیقت وہ زندہ ہیں اور اللہ کی طرف سے انھیں رزق مل رہا ہے۔

یاد رکھ کہ انصاف کرنے کے لیے اللہ اور تجھ پر دعویٰ کرنے کے لیے محمدؐ اور ان کی مدد کرنے کے لیے جبرئیل کافی ہیں۔ اور فقط یہی نہیں بلکہ عنقریب وہ بھی جان لے گا جس نے تجھے مسلمانوں کی گردن پر

سوار کیا اور تجھے غلط خلیفہ بنانے کی کوشش کی۔ اور سچ ہے ظالموں کو بدترین بدلہ دیا جائے گا پھر اس وقت تم لوگوں کو خود معلوم ہو جائے گا کہ تم لوگوں میں سے جہنم میں سب سے بدتر مقام پر کون گیا۔

افسوس! زمانے کے انقلاب نے مجھے مجبور کردیا کہ میں تجھ سے بات کروں ورنہ میں تجھے اس قابل نہیں سمجھتی اور یہ بھی سمجھتی ہوں کہ یہ زجرو توبیخ یہ سخت گفتگو تیرے لیے بیکار ہے۔ اس لیے کہ اس کا اثر تجھ پر کچھ نہیں ہوگا لیکن ہائے کیا کروں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، دل کباب ہو رہے ہیں۔ یہ عجیب حادثہ ہے کہ فوجِ شیطانی اور آزاد کردہ غلاموں کے ہاتھوں لشکرِ خدا کے عزت دار لوگ قتل ہو جائیں۔ ہم لوگوں کا خون ان کے ہاتھوں سے بہے۔ وہ ہمارا خون پئیں، ہمارے کلیجے چبائیں، پھر ہمارے شہیدوں کی پاک و پاکیزہ لاشوں کو میدان میں بے گوروکفن چھوڑ دیں اور ان کی زیارت کو جانورانِ صحرائی آیا کریں۔

اے یزید! اگر آج تو نے ہم لوگوں کو اپنا مالِ غنیمت سمجھ لیا ہے تو سُن لے کہ یہ مالِ غنیمت تیرے لیے باعثِ مضرت ہے اور خصوصاً اس روز جس روز تجھ

کو ان اعمال کی سزا ملے گی جو تو نے اس دار دنیا میں کیے ہیں۔ یقین کر اللہ اپنے بندوں کے ساتھ ناانصافی نہیں کرے گا۔ ہم لوگ اسی سے داد خواہ ہیں اور اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

اچھا اب تو ہر تدبیر کرلے، ہر چال چل لے، ہر مکر و فریب کرکے دیکھ اور ہماری عداوت کا کوئی پہلو نہ چھوڑ۔ مگر خدا کی قسم ان سب کے باوجود تو ہمارے ذکر کو نہیں مٹا سکتا، ہم سے وحی والہام کے رابطہ کو نہیں توڑ سکتا۔ تو ہمارے مقصد کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتا، تو ہم لوگوں کی غرض وغایت کو نہیں سمجھ سکتا اور اسی کے ساتھ تو اپنے دامن سے اپنے رسواکن کردار کا دھبہ نہیں چھڑا سکتا۔

سُن لے کہ تیری رائے سُست اور علیل ہے، تیرا خیال غلط ہے۔ اب تیرے گنتی کے چند دن رہ گئے ہیں۔ تیرا جتھہ بکھرنے والا ہے، تیرا زمانہ ختم ہونے والا ہے۔ خاص کر اس دن کو یاد کر جب حق کا منادی ندا دے گا کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو۔ اس خدا کا شکر کہ جس نے ہم لوگوں کی ابتدا سعادت سے کی اور خاتمہ شہادت پر کیا۔

میں خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ ہمارے شہیدوں کو پورا پورا ثواب دے بلکہ اس میں روزانہ اضافہ

کرتا رہے اور ان شہیدوں کا نائب ہم لوگوں میں سدا موجود رہے اور اپنے فضل واحسان کو ہم لوگوں پر ہمیشہ قائم و دائم رکھے۔ ہر امر میں ربّ رحیم اور خدائے ودود کافی ہے اور وہ بہترین وکیل ہے۔"[1]

دمشق کی سیاسی فضا دگرگوں ہوئی تو یزید کو فکر ہوئی کہ اب کسی دوسری تدبیر سے لوگوں کی اس بیداری کی مخالفت کی جائے۔

زمانے کو فکر صحیح انسان سے ہی ملتی ہے اور صرف انصاف پسند اور حق پرست ہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو باوجود قدرت فکر صحیح سے کبھی انحراف نہیں کرتے اور انہی لوگوں کے طریقۂ کار پر غور کرنا فکرِ صحیح کا اساسی خاکہ ہوتا ہے۔

اب یزید اپنی نادانی کی بنا پر اس فکر میں ہے کہ خاندانِ نبوّت وطہارت کو کسی نہ کسی طرح دبانے اور زیر کرنے کی ایک آخری کوشش اور بھی کرکے دیکھ لے۔ اس کے لیے اس نے یہ ترکیب نکالی کہ اہلِ شہر کے سامنے ان اسیروں کی بدگوئی کرے ان پر بہتان تراشے تاکہ اہلِ شہر ان اسیروں کو قابلِ رحم سمجھنا چھوڑ دیں اور اپنے خیالِ خام میں وہ یہ امر محال مسجد دمشق میں انجام دے سکتا تھا۔ مسجد میں عام مسلمانوں کا مجمع ہوتا ہے۔ عبادت کے علاوہ وہ ہر طرح کی گفتگو کی جگہ بھی ہے۔ اس بنا پر یزید چاہتا تھا کہ اس مقام سے عوام کا سامنا کرے اور اپنے نامناسب خیالات لوگوں کے دلوں میں اُتار دے۔ حالانکہ

---

[1] منتہی الآمال صفحہ ۱۱۳ و کتاب اللہوف علی قتلی الطفوف، ابن طاؤس ترجمہ سید احمد زنجانی صفحہ ۱۸۱ میں بھی یہی تحریر ہے۔

اس نے غلط سوچا۔ جس خانۂ خدا میں حضرت سجادؑ تمام لوگوں سے زیادہ دعاؤں اور مناجاتوں میں مشغول رہتے ہوں، وہاں بھلا کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ ان کا اللہ سے ربط نہیں۔

بہر حال اس نے ایک خطیب کو حکم دیا کہ وہ منبر پر لوگوں سے خطاب کرے اور ان خارجیوں اور بے دینوں سے یزید کی جنگ کو درست ثابت کرے اور اس موضوع پر خصوصی توجہ دے۔ ظاہر ہے خطیب تو وہی کہے گا جو خلیفہ کا حکم ہے۔ لہٰذا وہ حضرت امیر المومنینؑ اور ان کے فرزند امام حسینؑ جن کے انسانیت کی گردن پر بے شمار احسانات ہیں' کی شان میں ہرزہ سرائی کرنے لگا اور ان عبادت گزاروں کو خدا کا منکر اور ان شکر گزاروں کو اللہ کا باغی بتانے لگا اور کہنے لگا' یہ لوگ بڑے بدخصلت، بداعمال، اور پست ترین لوگوں میں سے تھے۔ اسی مجمع میں سے امام زین العابدینؑ نے اسے اس دروغ گوئی پر ٹوکا کہ تو اللہ کی خوشنودی پر مخلوق کی خوشنودی کو کیوں ترجیح دے رہا ہے، تو یزید کو خوش کرنے کے لیے اللہ کو کیوں اپنے سے ناراض کر رہا ہے اور کیوں حقائق کو چھپا رہا ہے۔ اس طرح امام زین العابدینؑ اس کو ہوشیار کر رہے تھے کہ وہ خود سوچ لے کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔

خطبۂ امام زین العابدینؑ

دشمنوں کے بھرے مجمع میں ایک غریب، تن تنہا شخص کا کسی کو ڈانٹنا بڑی دلیری کا کام ہے۔ امامؑ کی گرجتی ہوئی آواز پر لوگ متوجہ ہوئے اور بولے کہ اس ہاشمی کو بھی اپنے دفاع کا حق ملنا چاہیے تاکہ اصل حقیقت کھل کر

سامنے آئے۔ اسے بھی موقع دیا جائے کہ یہ جو کہنا چاہتا ہے کہے۔ مگر یزید انھیں اس کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ لیکن ہر طرف سے لوگوں کے اصرار پر اس کو قبول کرنے کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ یہ یزید کی دوسری شکست تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ خطابت کے زور پر اپنے اقدام کو درست ثابت کرائے اور اب اسے لرزتے ڈرتے ہوئے ایک شخص کو منبر پر دیکھنا پڑ رہا ہے۔ وہ ایسا خطیب ہے کہ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے مقابلے میں بول سکے خاص کر اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور جو کر رہا ہوں' راہ خدا میں اللہ کی خوشنودی کے لیے کر رہا ہوں۔

بالآخر لوگوں کے سکوت و انتظار کو امام کے خطبہ نے توڑا۔ پہلے آپ اپنا تعارف کراتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ:

"ایہاالناس! اس مجمع میں جو مجھے پہچانتا ہے وہ تو پہچانتا ہی ہے۔ لیکن جو نہیں پہچانتا' وہ سن لے کہ میرا حسب و نسب کیا ہے تاکہ مجھے جان لے۔

میں اس کا فرزند ہوں کہ جس نے رسولؐ کے روبرو شمشیر زنی کی دو تلواریں لے کر' اور نیزہ بازی کی دو نیزے لے کر' دو مرتبہ ہجرت کی، دو مرتبہ بیعت کی اور جنگ بدر و حنین میں کافروں سے جہاد کیا۔ اور خدا کی قسم وہ ایک لمحہ کے لیے بھی کبھی کافر نہیں ہوئے۔

میں اس کا فرزند ہوں جو صالح المومنین ہے، وارث النبیین ہے، قاتل ملحدین ہے، بادشاہ مسلمین ہے، زینت عابدین ہے، خوف خدا سے رونے والوں کا سرتاج

ہے ، تمام صابروں میں سب سے زیادہ صبر کرنے والا
ہے اور آلِ یٰسین ، رسولِ رب العالمین میں سب سے
بہتر نماز گزار ہے ۔

میں اس کا فرزند ہوں کہ جس کی تائید جبرئیلؑ نے کی اور
جس کی نصرت میکائیلؑ نے کی۔

میں اس کا فرزند ہوں جس نے مسلمانوں کے حرم کا
دفاع کیا، جس نے قاسطین و مارقین وناکثین سے
جہاد کیا، جس نے باغیوں ، سرکشوں اور ناصبیوں سے
جنگ کی، جو قریش کے ہر گروہ کے ہر چلنے پھرنے والے
سے بہتر ہے جس نے تمام اہلِ ایمان میں سب سے پہلے
اللہ اور اس کے رسولؐ کی دعوتِ ایمان قبول کی ، جو
سابق الایمان ہے، جو ظالموں کو شکست دینے والا ،
مشرکوں کو ہلاک کرنے والا اور منافقوں کے لیے اللہ کے
تیروں میں سے ایک تیر تھا۔ جو اللہ کی حکمت کے لیے
زبان، دینِ خدا کا مددگار اور خدا کا ولیٔ امر تھا۔ وہ خدا
کی حکمتوں کا باغ اور اس کے علم کا صندوق تھا۔ بہادر،
سخی، کشادہ رُو، اور ہر طرح کے حسنِ سلوک کا جامع
تھا۔ وہ بطحا کی ایک پسندیدہ شخصیت، خود سے ہر
جنگ میں آگے بڑھنے والا، متحمل مزاج بادشاہ، پاکیزہ
اخلاق، کثیر القیام، نسلوں اور پشتوں کو کاٹنے والا ،
صف شکن تھا، جو ثابت قدمی کے ساتھ اپنے نفس پر

قابو رکھتا تھا۔ جو سب سے زیادہ قوی دل، سب سے
زیادہ ثابت قدم، عزم میں سب سے راسخ تر، اور
مظلوموں کا سب سے بڑا فریادرس تھا۔ وہ میدانِ
جنگ کا وہ شیرِ ژیاں تھا جو دشمنوں کو چیر پھاڑ کر ختم
کر دیتا ہے۔ سوار اور پیادے جب اپنے نیزوں سے اس
پر حملہ کرتے تو وہ انھیں اس طرح منتشر کر دیا کرتا جیسے کوئی
آندھی اور طوفان خس وخاشاک کو بکھیر دیتے ہیں ۔ وہ
اہلِ حجاز میں سب سے زیادہ شجاع ، اہلِ عراق میں سب
سے زیادہ دلیر تھا۔ مکہ کا باشندہ، مدینہ کا رہنے والا ،
مسلمانوں میں ہر فرد سے زیادہ پاکیزہ دین رکھنے والا تھا۔
وہ عقبہ میں بیعت کنندہ تھا۔ شہسوارِ بدر و اُحد تھا۔ وہ
بیعتِ شجرہ کا مردِ شجاع، واقعہ ہجرت میں بے مثل فداکار،
عرب کا سردار، میدانِ جنگ کا شیر، وارثِ مشعرین ،
اور رسولؐ کے دونوں نواسوں حسنؑ و حسینؑ کا پدرِ نامدار تھا۔
یہ سب ہیں میرے جد علی ابن ابی طالبؑ کے فضائل۔

اور سنو!

میں خدیجۂ کبریٰؑ کا فرزند ہوں۔

میں فاطمہ زہراؑ کا فرزند ہوں۔

میں اس کا فرزند ہوں جس کا سر پس گردن سے جدا
کر دیا گیا۔

میں اس کا فرزند ہوں جو دنیا سے پیاسا گیا۔

میں اس کا فرزند ہوں جسے پانی پینے سے روکا گیا حالانکہ
مخلوق کے لیے کھلی اجازت تھی۔
میں اس کا فرزند ہوں جس کو ان لوگوں نے نہ بعد شہادت
غسل دیا اور نہ کفن دیا۔
میں اس کا فرزند ہوں جس کا سر کاٹ کر نیزے پر بلند
کیا گیا۔
میں اس کا فرزند ہوں جس کے اہلِ حرم کو اسیر کر کے ان
کی توہین کی گئی۔
میں اس کا فرزند ہوں جس کی لاش کہیں اور سر کہیں ہے۔
میں اس کا فرزند ہوں جس کے اہل حرم کو اسیر کر کے شام
لایا گیا۔"

ان کلمات کو سُن کر اہلِ مسجد کا حال بدل گیا۔ لوگ زار و قطار رو رہے تھے۔ یہ دیکھ کر یزید کو بڑی پریشانی ہوئی اور امامؑ کے سلسلۂ تقریر کو ختم کرنے کے لیے اس نے مؤذن کو حکم دیا کہ اذان کہے۔

اس کا خیال تھا کہ بیانِ حقائقِ محمدیہؐ کو اذان روک دے گی حالانکہ ایسا نہیں۔ کلامِ پیغمبرؐ اور کلام فرزندانِ پیغمبرؐ کے درمیان ایسا مضبوط ربط ہے جو ناقابلِ انقطاع ہے اور انہی دونوں کے ربط سے اسلامِ حقیقی میں جان آئے گی۔

درحقیقت یزید غلطی پر غلطی کر رہا تھا۔

اگر مسجد میں اللہ اکبر کی آواز گونجے اور ہر شے سے اللہ کے بڑا ہونے کی گواہی دی جائے تو کیا یہ امام کے خطبہ سے مربوط نہیں اور اس سے ان کے

کلام کی تائید نہیں ہوگی؟

اگر اللہ کے ہونے کی گواہی دینا مسلمان ہونے کی بنیادی شرط ہے تو کیا فرزندِ رسولؐ بھی یہی نہیں کہہ رہے ہیں کہ میرا دل، میری زبان، میرا گوشت، میرا خون، سب اللہ کے ایک ہونے کی گواہی دیتے ہیں؟

اب یزید انتظار کر رہا ہے کہ مؤذن اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہ کہہ کر رسولؐ کی رسالت اور ان کی حقانیت کی آواز لوگوں کے کانوں تک پہنچائے۔ کیا وہ یہ بھول گیا ہے کہ رسولؐ اسی کے جد تو ہیں جسے مرتد اور تارکِ اسلام کا اتہام دے کر بستۂ زنجیر کیا گیا ہے اور اس کے اہلِ حرم کو اسیر کیا گیا ہے۔

اس طرح یزید اپنی انتہائی نادانی کی وجہ سے خود اس مردِ دلیر کی حقانیت اور سچائی کو ظاہر کرنے کا سبب بن رہا ہے اور خود کو رسوا کر رہا ہے اور وہ اس طرح کہ امامؑ نے اس سے سخت لہجے میں پوچھا:

"اے یزید! یہ بتا کہ یہ محمدؐ میرے جد تھے کہ تیرے جد
تھے۔ اگر یہ کہتا ہے کہ تیرے جد تھے تو غلط اور جھوٹ
کہے گا اور اگر یہ کہتا ہے کہ یہ میرے جد تھے تو یہ بتا
کہ تو نے ان کی عترت اور ان کے اہل بیتؑ کو کیوں قتل
کیا اور پھر ان کے اہلِ حرم کو کیوں اسیر کیا"

اس سوال کا یزید کے پاس جواب ہی کیا تھا سوائے اس کے کہ اپنی فضیحت کو قبول کرے اور مجمع سے اُٹھ کر چلا جائے۔ یہاں بھی خاندانِ عصمتؑ طہارت اور خاندانِ پُر از معصیت و نجاست کے درمیان منہ در منہ کی جنگ میں فتح حق کو حاصل ہوئی۔

امامؑ سے الجھتے وقت، جس کے نتیجے میں اس کو رسوائی نصیب ہوئی، یزید یہ نہ سمجھ سکا کہ اس طرح وہ اولادِ رسولؐ کی عظمت و معرفت کا سبب بن رہا ہے اور حق کو شکست دینے کی اس کی آرزو بھی پوری نہیں ہوئی۔

یزید کی شکست اور امام کی فتح

عوام کو اصل واقعات کا علم ہو جانے کے بعد اب یزید اپنے سابقہ خیال کے برخلاف مجبور تھا کہ ان اسیروں کے حال پر افسوس کرے مجبور تھا کہ اپنی عزت بچانے کے لیے، اگرچہ عزت ہی کہاں تھی، اپنے گزشتہ اقدامات پر اظہارِ ندامت و پشیمانی کرے۔ مجبور تھا کہ شماتتِ مردم سے بچنے کے لیے کربلا کے شہیدوں کے خون کا ذمہ دار ابنِ زیاد کو ٹھہرائے مجبور تھا کہ نرم لہجہ کے ساتھ حسینؑ کے پسماندگان کو اختیار دے دے کہ خواہ یہاں رہیں، خواہ اپنے وطن یا جہاں چاہیں چلے جائیں۔ اور اس کا یہ اقدام درحقیقت نیکوں کے سامنے اپنی شکست کے اعتراف کو ظاہر کرنا ہے۔

یہ امامؑ کی فتح ہے اور بہت بڑی فتح۔ اس لیے کہ اس کے بعد ان کو موقع ملا کہ وہ کربلا کے خونی میدان میں شہداء کی شجاعت اور شہادت کے واقعات دنیا کے کانوں تک پہنچائیں۔ ان کو اس کا موقع ملا کہ وہ دنیا کو یہ بتائیں کہ شہیدِ عاشورا کا شجاعت میں درجہ کتنا بلند تھا اور انھوں نے کس مقصد کے لیے اپنی جان دی۔ ان کو موقع ملا کہ وہ بتائیں کہ تاریخ کی اس بڑی شخصیت کو محض توحید، حریت، نجات اور قرآن کے متعلق اللہ اور اس کے رسولؐ کے فرمان کو یاد دلانے پر شہید کر دیا گیا۔

اور یہ تمام باتیں اس جنگ کی حقیقت اور اس کی گہرائی کو واضح کرتی ہیں جو اونٹوں کی برہنہ پشتوں سے شروع ہو کر دربارِ حکومت تک مسلسل رہی۔ ہاں! یہ سب جانتے ہیں کہ جنگ ہمیشہ تلوار ہی سے نہیں لڑی جاتی اور فتح و ظفر ہمیشہ میدانِ جنگ ہی میں حاصل نہیں ہوتی۔ وہ مصائب و خطرات جو اس قافلہ کے پیچھے چل رہے تھے، ان میں یک بیک تبدیلی رونما ہوئی۔ ان کی اسیری آزادی میں بدلی۔ اب انھیں اس کی فرصت ملی کہ اپنے شہیدوں کا سوگ منائیں اور انھیں یاد کریں۔ اور اس شہرِ دمشق میں ان کا سوگ منایا جانا جہاں کہ انھیں قتل کا حکم صادر ہوا تھا، بخوبی اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ بالآخر حق پر کون تھا۔

اہلِ حرم کی واپسی

اب امام زین العابدینؑ اپنے جد بلکہ تمام اہلِ مدینہ کے لیے یہ دردناک خبر لیے ہوئے با دلِ مغموم مدینہ واپس آتے ہیں۔ دلیلِ قافلہ کو حکم دیا کہ آگے بڑھ کر اہلِ مدینہ کو ان الفاظ میں خبر دیدے:

"اے اہلِ مدینہ! اب یہ مدینہ ہم لوگوں کے رہنے
کے قابل نہیں رہا۔
حسینؑ قتل کر دیے گئے۔ ان کے غم میں ہمارے آنسو
جاری ہیں۔
ان کا جسمِ اطہر زمینِ کربلا پر خاک و خون میں آلودہ
پڑا رہا۔
اور ان کا سر نوکِ نیزہ پر بلند کر کے شہر بہ شہر

پھرایا گیا۔

اے اہلِ مدینہ! اپنے آقا و پیشوا پر ترس کھاؤ۔ کیا تم میں اب کوئی بھی صاحبِ غیرت نہیں ہے؟"

اہلِ مدینہ کے چہروں پر امام حسینؑ کے کوچ کر جانے کی وجہ سے جو داغ لگا تھا، اب ان باتوں کی وجہ سے دوگنا ہوگیا۔ انھیں احساس ہوا کہ افسوس ہم نے پیشواؤں کی قدر نہ کی، انھیں تحفظ نہ دیا اور اب ان کی شہادت کی خبر سُنی جارہی ہے۔ بے چین ہوکر، بیرونِ مدینہ امامؑ کی خدمت میں پہنچے۔ امام زین العابدینؑ نے مدینہ میں بیٹھے رہنے والوں سے خطاب کیا اور ساری سرگزشتِ غم سنائی۔ آپ نے فرمایا:

اہلِ مدینہ سے خطاب

"حمد مخصوص ہے اس ذات کے لیے جو تمام عالموں کا پروردگار، مالکِ یومِ جزا اور تمام مخلوق کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہ عقلوں کی رسائی سے بہت دُور ہے۔ پوشیدہ سے پوشیدہ راز اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں اپنے ان عظیم حادثات پر، زمانے کے مصائبِ دردانگیز پر، ابتلا و آزمائشِ صبرشکن پر، ماتم و عزا پر، غم کے آتشِ سوزاں پر، مصائب و اندوہ کی تند و گرم آندھیوں پر، نازل ہونے والی مصیبتوں پر اور ان بلاؤں پر جو انسان کو چور چور کر دیتی ہیں۔

ایّہاالنّاس! ہم اہلِ بیت کو اللہ تعالیٰ نے عظیم مصیبتوں میں مبتلا کیا۔ اسلام کے اندر بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ لوگوں نے سردارِ جوانانِ اہلِ جنّت کو قتل کیا، ان کی عترت کو تہہ تیغ کیا، ان کے بچّوں کو اسیر کیا اور ان کے سر کو نوکِ نیزہ پر بلند کر کے شہر بہ شہر پھرایا۔

یہ وہ مصیبتیں ہیں کہ دنیا میں جن کی مثال نہیں، ان دل دوز مصائب کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد کون سا دل ہے جو غمگین نہ رہے اور ان مصائب کو سننے کے بعد کون سی آنکھ ہے جس سے آنسو نہ جاری ہوں۔ ان مصائب پر ساتوں آسمان نالاں ہو گئے، سارے دریا چیخ اٹھے، آسمان ہلنے لگے، زمین کانپنے لگی۔ درختوں کی شاخیں ماتم کرنے لگیں، دریا کی مچھلیاں آتشِ غم میں بھننے لگیں، طائر اپنے آشیانوں میں، چرنے والے جانور صحراؤں میں رونے لگے۔ یہی نہیں بلکہ سیّدالشہداء کے مصائب پر عالمِ بالا کے قدسی بھی خون کے آنسو بہانے لگے۔

ایّہاالنّاس! کون سا دل ہے جو اس غم میں پاش پاش نہ ہوا ہو، کون سا سینہ ہے جو اس ماتم میں زخمی نہ ہوا ہو اور کون سا ایسا کان ہے جو یہ سُن کر کہ اسلام کی دیوار میں شگاف آگیا، بے چین نہ ہوا ہو۔

اے لوگو! ہم سب لوگ اپنے شہر، اپنے دیار سے اس طرح مارے مارے پھرائے جا رہے تھے جیسے ہم لوگ ترک و کابل کے قیدی ہوں۔ بے جرم، بے خطا، بلا ارتکابِ گناہ، اور بغیر اس کے کہ ان لوگوں نے ہمیں یا ہمارے باپ کو کوئی رخنہ اسلام میں ڈالتے ہوئے دیکھا یا سُنا ہو۔ یہ سارے مظالم ان لوگوں نے اپنی بدخوئی اور کینہ پروری کی وجہ سے ہم لوگوں پر ڈھائے۔ یہ ان کے مظالم کا ایک حصّہ تھا جو ہم لوگوں تک پہنچا۔

خدا کی قسم پیغمبرِ اسلامؐ نے جس طرح ہم اہلبیتؑ کے اعزاز و اکرام کا حکم دیا تھا، اگر بالفرض وہ ان لوگوں کو یہ حکم دے جاتے کہ ہماری عترت کو قتل کرنا یا ان سے جنگ کرنا تو جتنا ان لوگوں نے اب کیا ہے، اس سے زیادہ اس وقت بھی نہیں کر سکتے تھے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ! ان جان لیوا مصائب پر، جو بے چین و آرام کر دینے والے، دل کو آتشِ غم میں جلانے والے، قلب کی قوّت کو ختم کر دینے والے اور زندگی کو تلخ کر دینے والے ہیں، ہم اللہ سے اجر و ثواب کے طلب گار ہیں۔ اور ہم نے ان مصائب کو اس کے سامنے گنایا ہے اس لیے کہ وہی مظلوموں کا انتقام لینے والا اور صابروں کو اجر دینے والا ہے۔"

یہ جان سوز خطاب تو اہلِ مدینہ سے تھا۔ اب اس سے زیادہ جان سوز

وہ نالہ و فریاد ہے جو آپ نے اپنے جد کے مزار پر کیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے یوں فریاد کی:

قبرِ رسولؐ پر فریاد

"اے جدِ بزرگوار! اے افضلِ انبیاء! میرا دل غم میں ڈوبا ہوا ہے، میں بیمار ہوں، قید سے چھوٹ کر آ رہا ہوں۔ ہمارا کوئی یار و مددگار نہیں۔ طاقت نہیں کہ زور سے بات کروں، اس لیے آہستگی سے کہتا ہوں کہ آپ کا حسینؑ قتل کر دیا گیا، آپ کی نسل تباہ ہو گئی۔ ہم لوگ کنیزوں اور غلاموں کی طرح اسیر ہوئے۔ ہمیں بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ اے جدِ بزرگوار! آپ کے بعد بنی امیّہ کا نیا روپ اور ان کا ظلم و جور ہم لوگوں پر ظاہر و ہویدا ہو گیا۔"

امامؑ مدینہ واپس آ گئے۔

یہ تھا آپ کے فرائض اور ذمّہ داریوں کا پہلا حصّہ جو آپ نے انجام دیا۔ کسی کو جہادِ کربلا کی شمع بجھانے کی اجازت نہیں دی اور ایسی آواز بلند کی کہ بنی امیّہ اور حکومتِ بنی امیّہ لاکھ کوشش کرے مگر کربلا والوں کے خون سے اپنا دامن نہیں بچا سکتی۔

اور اب آپ اپنی ذمّہ داریوں کے دوسرے حصّہ کی طرف متوجہ ہوئے اور امورِ زندگی کی اصلاح میں، لوگوں کی ہدایت شروع فرمائی۔

امامؑ کی زندگی کا دُوسرا حِصّہ

آپ کی زندگی کے اس حصہ کی تاریخ بھی مکمل سچائی کی تاریخ ہے۔ ایک ایسے مرد کی تاریخ جو رہنمائے انسانیت ہے اور جس کی زندگی ایک مثالی اور قابلِ تقلید زندگی ہے۔ اور اس طرح کی زندگی بسر کرنا ایک بگڑے ہوئے اور پُر از محرمات معاشرہ کے خلاف ایک نیا اور مستقل جہاد ہے۔

یہ وہ وقت ہے کہ لوگوں کی زندگیاں ان تمام چیزوں سے پُر ہیں جن کے لیے اسلام میں نہی آئی ہے اور لوگ بھی کیا کریں جب ان کا صدرِ مملکت ہی اسلامی قوانین اور دستور کو ناقابلِ توجہ تصور کرتا ہے تو قوم بھی اپنے صدر کی پیروی میں مقررات اسلامی کو پامال کرے گی۔

یزید اپنی زناکاری، شراب خوری، قماربازی اور دیگر دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ، لوگوں سے ملنے میں رسمی تکلفات و تشریفات، اور جس کے پاس جتنی زیادہ دولت ہو اس کا اتنا ہی زیادہ احترام، پر عمل کر کے اسلام

کے اجتماعی طرزِ زندگی کو تبدیل کر رہا تھا۔ اس کے حاشیہ نشین اور درباری نیز عمالِ حکومت جو اس کے کردار کا عملی نمونہ اور مثال تھے، اپنے اِن اعمال سے اسلامی رسوم و قوانین کو اپنے پیروں سے روند رہے تھے۔ گویا وہ یہ چاہتے تھے کہ وہی ناہموار اور غیر متوازن معاشرہ پھر سے پیدا کر دیں جو قبل از اسلام قائم تھا۔

اسلام سے پہلے سرزمین عرب پر ایک ناہموار، غیر متوازن اور بے راہ رو معاشرہ عرصہ سے رائج تھا۔ نفع پرستوں اور سرمایہ داروں کی طرف سے حکام کے اپنے بنائے ہوئے قوانین عوام پر عائد کر دیے جاتے تھے۔ اسی اثنا میں اسلام آیا اور وہ اپنے ساتھ معاشرہ کے لیے متوازن اور ہموار دستورِ زندگی لے کر آیا۔ ایسا متوازن اور ہموار دستور جو ناممکن ہے کہ مستقبل کے کسی دَور میں بھی انسان کی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے میں غیر مؤثر اور نارسا ثابت ہو۔ چنانچہ جس دَور میں اسلامی قوانین نافذ تھے، اس پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کس قدر مکمل تھے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ توازن جو اسلام لے کر آیا ہے، اس وقت کے رائج رسوم و قوانین کی مخالفت میں صرف دکھانے کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ ان عمومی قوانین کے ساتھ اس مسئلہ پر بھی اس کی نظر تھی کہ وہ مرکز جس نے سارے معاشرہ کو بے راہ رو بنا دیا ہے، اس کے مقابلہ میں ایک دُوسری مرکزی شخصیت تیار کی جائے جو نظامِ اسلامی کو مکمل طور پر نافذ کرے اور معاشرہ کو بے راہ رو ہونے یا اعتدال سے ہٹنے کی اجازت نہ دے۔ پھر یہ اسلامی آئیڈیولوجی و نظریات ایک بہترین معاشرہ پیدا کر دیں گے۔

لیکن اب وہ عناصر جو غیر متوازن معاشرہ کے سربراہ اور مرکزی شخصیت

تھے، چونکہ ان پر اسلام کے پیش کردہ قوانین سے ضرب پڑتی تھی اس لیے وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر اسلامی نظریات سے ٹکرانے کے لیے آمادہ ہو گئے اور چاہتے تھے کہ کوئی ایسی ترکیب کریں کہ یہ معاشرہ دوبارہ بے راہ رو اور غیر متوازن ہو جائے اور انہی برائیوں اور ناشائستگیوں کی طرف پھر سے مائل ہو جائے۔

جب معاشرہ کا سربراہ ایسا ہو جائے کہ اسلام کے بھیس میں اسلامی نظریات سے عمداً روگردانی کرے تو عوام کے لیے اس کی پیروی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ پھر یہ انحراف اور لذت پرستی اور مقرراتِ اسلام کی عدم رعایت معاشرہ کا معیار بن جاتا ہے اور وہ خدا سے دور ہوتا جاتا ہے۔

ان نافرمانیوں کے باوجود اسلامی قوانین اپنی جگہ موجود ہوتے ہیں، اگرچہ اس سے کیا فائدہ، جب ان پر عمل نہیں ہوتا۔ جب ان پر عمل ہو گا تب ہی تو بے راہ روی ختم ہو گی۔

اب ان تمام خودسریوں کے مقابلہ میں ایک مرد ہے جو چاہتا ہے کہ موجودہ ماحول کے بالمقابل اپنی طرزِ زندگی کو پیش کر کے عوام کے لیے ایک مرکز بن جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ سنگین فریضہ امامؑ کا ہے اور یہ جنگ اس سے زیادہ سنگین ہے جو کوفہ و شام کی راہوں میں استحصال کرنے والوں سے لڑنی پڑی۔

یہاں وہ یہ چاہتے ہیں کہ زندگی کی فاسد بنیادوں کو بدل دیں۔ اس وقت اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ماضی کی طرح شمشیر سے جنگ کا وقت گزر گیا۔ اس وقت طاقت کے ساتھ تلوار تھی اور آج صرف حقانیت ہے، طاقت نہیں ہے۔ لہٰذا اندازِ جنگ کو دوبارہ بدلنے کی ضرورت ہے۔

امامؑ کا طرزِ ہدایت اور اصلاحِ معاشرہ

امام زین العابدینؑ نے یہی کیا۔ وہ بہترین محاسنِ زندگانی کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ وہ اپنے روزمرہ کے کاموں کے ذریعے امورِ ہدایت انجام دے رہے تھے۔ ورع، تقویٰ اور عبادت، طبقاتی امتیازات کو مٹانا، ان کا کام تھا۔ یعنی یہ کہ وہ برائیاں جو معاشرہ پر غالب آگئی تھیں اپنے عمل سے ان کی مخالفت ظاہر کرنا۔ آپ عبادت میں مشغول رہتے، بندے آزاد کرتے اور تمام انسانوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے جبکہ لوگ حکمِ پیغمبرؐ کے خلاف اپنے زیردستوں اور اپنی رعایا کو زرخرید غلام اور خود کو ان کی جان و مال کا مالک سمجھتے تھے۔ آپ بارگاہِ خدا میں بحالتِ نماز اس قدر قیام فرماتے تھے کہ آپ کے زانو زخمی ہو جاتے، کہ وہ لوگ جو فریضۂ نماز کو بھولے ہوئے ہیں انھیں نماز یاد آجائے۔ راہِ خدا میں بے حساب خرچ کرتے، اس لیے کہ لوگ دولت پرست ہو گئے تھے۔ مسکینوں اور محتاجوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا رکھتے، کیونکہ اونچے طبقے کے لوگ نچلے طبقے کے لوگوں سے مل بیٹھنے کو بے عزتی اور توہین سمجھتے تھے، آپ اپنے دشمنوں کو پناہ دیتے، اس لیے کہ آپ دیکھ رہے تھے کہ معاشرہ میں شرافت اور بخشندگی اس حد تک مردہ ہو چکی ہے کہ دوستوں کے درمیان بھی تلوار کھنچ جاتی ہے۔ اسی بنا پر آپ نے مناسب سمجھا کہ اپنے کردار سے معاشرہ کی ڈگر کو تبدیل کر دیں۔ یا اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اتنا تو ضرور ہو کہ لوگ اسلامی مقررات کو فراموش نہ کر سکیں اور روحانیت پائیداری کے ساتھ اپنی جگہ باقی رہے۔

امامؑ کا عطا کردہ منشور

امامؑ کو خاندانی آسودگی کے ساتھ، اپنی زندگی میں اس کا موقع ملا کہ اکثر آپ نے اسلامی مسائل اور علوم کی شرح و تفسیر فرمائی۔ آپ نے بذریعہ الہام معاشرہ کو رواں دواں رکھنے کے لیے ایک ایسا منشور قوم کو عنایت فرمایا جس کا شمار معاشرہ کے بیش قیمت ترین مقررات میں ہوتا ہے۔

اس منشور سے انسان کی انفرادی و اجتماعی ذمہ داریاں معلوم ہوتی ہیں اور اگر واقعاً اس پر عمل کیا جائے تو اس کا نتیجہ فرد اور اجتماع دونوں کی سلامتی ہے۔

حقوق و فرائض

اس منشور میں جن کے حقوق کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں؛

خدا، نفس، زبان، کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں، شکم، شرمگاہ، نماز، حج، روزہ، صدقہ، قربانی، سلطان، مربی، اہلکار، شاگرد، عورت، مملوک، مادر، پدر، برادر، نیکوکار، مؤذن، امام، کاریگر، ہمسایہ، رفیق، شریک کار، طلب گار، دوست، دشمن، مشاور، نصیحت خواہ، ناصح، بزرگ، خورد، مسئول، بدکار، اور اہل ذمہ وغیرہ کے حقوق۔

① خُدا کا حق:

یہ ہے کہ اس کا کسی کو شریک نہ بناؤ اور خلوص نیت و عقیدت سے اس کی حمد کرو۔ اپنے تمام جزوی و کُلّی امورِ دنیا و آخرت میں اس کو اپنے لیے کافی سمجھو۔ اس پر کامل ایمان رکھو۔ اس یقین کے ساتھ کہ جو کچھ تمھیں پسند و مطلوب ہے، وہ تمھارے لیے محفوظ رکھے گا۔

② نفس کا حق:

یہ ہے کہ تم اسے اطاعتِ الٰہی میں مشغول رکھو یعنی تمام اعضا و جوارح جو نفس کے تکملہ کے لیے آلۂ کار ہیں، ان سے وہی کام لو جس کے لیے وہ پیدا کیے گئے ہیں۔

③ زبان کا حق:

یہ ہے کہ انسان گفتگو میں زبان کو بد دیانتی اور دشنام دہی سے بچائے اور اسے خیر و برتری کے لیے استعمال کرے۔ فضول و بے محل و بے سبب گفتگو ترک کر دے۔ لوگوں کے ساتھ خوش بیانی اختیار کرے، اپنی زبان کو برمحل گفتگو اور ادب و تہذیب سے آراستہ کرے۔ بے محل اور بے تکی باتیں

نہ کرے۔ خاموشی کے موقع پر خاموش رہے، گفتگو کے موقع پر فصاحت و بلاغت کے ساتھ بولے۔

④ کان کا حق:

یہ ہے کہ بہترین آسمانی لحن کو سُنے منتخب ترین کلام کو سماعت کرے اور جس کا سُننا جائز نہیں اس سے پرہیز کرے۔

⑤ آنکھ کا حق:

یہ ہے کہ جن چیزوں کا دیکھنا جائز نہیں اس سے آنکھ پھیر لے اور نگاہ ہٹالے۔

⑥ ہاتھ کا حق:

یہ ہے کہ اسے مباح اشیاء کے لیے بڑھایا جائے۔ مضبوط ہاتھ کمزوروں کی دستگیری اور گرتے ہوئے لوگوں کو سنبھالنے کے لیے ہیں۔ جمہوری رسم و رواج یہ ہے کہ ائمۂ دین کے ہاتھ پر بیعت و اطاعت اور عہد و پیمان کے لیے ہاتھ بڑھایا جائے اور وہ جو فریضہ تمھیں بتائیں اس پر عمل کیا جائے۔

ہاتھ اس لیے ہے کہ ثوابِ آخرت حاصل کرنے کے لیے دنیا میں لوگوں پر بذلِ مال کے لیے کھلا رکھا جائے اور اسے دنیا کی اس قلیل فرصت میں اللہ کی رضا و حصولِ ثوابِ آخرت کے لیے نیک کاموں میں استعمال کیا جائے اور اسے کھلا رکھ کر اپنی عقل و فضل و شرف کا اظہار کیا جائے۔

⑦ پاؤں کا حق:

یہ ہے کہ اسے حرام اور ناجائز راستے پر ایک قدم بھی نہ اٹھایا جائے

اور جو راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے اس میں جلدی نہ کرے۔ تھوڑا ٹھہرے سوچ سمجھ لے تاکہ روشن ترین و نزدیک ترین اور مستقیم ترین راستہ کا انتخاب کرسکے۔ ایسا نہ ہو کہ جلدی میں ایسا راستہ اختیار کرے جو اسے نیستی و زوال اور موت کے کنارے پہنچا کر واصلِ جہنم کردے۔

⑧ پیٹ کا حق:

یہ ہے کہ اسے حلال غذا سے خالی نہ رکھو اور حرام غذا سے پرہیز کرو۔

⑨ شرمگاہ کا حق:

یہ ہے کہ اسے زنا سے محفوظ رکھا جائے اور نامحرم کی نگاہ سے بچایا جائے۔

⑩ نماز کا حق:

یہ ہے کہ اسے تقربِ الٰہی کا ذریعہ سمجھا جائے۔ نماز گزار کو چاہیے کہ حصولِ ثواب اور مقامِ تقرب تک پہنچنے کے لیے اسے نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرے اور اس طائر کے مانند بن جائے جو اپنے پَر و بال کھولے ہوئے حق کی بارگاہ تک اُڑ کر پہنچنا چاہتا ہے۔ چہرہ خاک پر ملا جائے اور خوب مناجات کی جائے۔

⑪ حج کا حق:

یہ ہے کہ اسے راہِ حق پالینے کا وسیلہ، اُس کے گھر تک پہنچنے کا ذریعہ اور مکتبِ الٰہی کو تسلیم کرنا سمجھو۔ حج سے گناہ معاف ہوتے ہیں، توبہ قبول ہوتی ہے اور حاجات پوری ہوتی ہیں۔

(۱۲) روزہ کا حق:

یہ ہے کہ اسے یہ سمجھو کہ اللہ نے تمھاری زبان، تمھارے کان، تمھاری آنکھ، تمھارے پیٹ اور تمھاری شرمگاہ پر ایک پردہ ڈال دیا ہے تاکہ وہ آتشِ جہنم سے دُور رہیں۔

(۱۳) صدقہ کا حق:

یہ ہے کہ جو صدقہ تم دے رہے ہو اسے یہ سمجھو کہ اللہ کے پاس اسے ذخیرہ کر رہے ہو، اللہ کے پاس بطور امانت رکھ رہے ہو۔ اس میں کسی گواہ کی ضرورت نہیں ہے۔

انسانی معاشرہ کا رواج و دستور ہے کہ جب کوئی چیز کسی کے پاس امانت رکھی جاتی ہے تو اس پر کسی کو گواہ بھی بنایا جاتا ہے اور اگر پوشیدہ رکھی جاتی ہے تو اس کا شاہد صرف اللہ ہوتا ہے۔ صدقہ در پردہ اور پوشیدہ طور پر دیا جاتا ہے اور اللہ کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

(۱۴) قربانی کا حق:

یہ ہے کہ یہ سمجھو کہ اس کے ذریعہ خدا سے تمھارا رابطہ قائم ہوتا ہے، اس کا تقرب حاصل ہوتا ہے اور اس کی خوشنودی کے لیے اس کی بارگاہ میں ہدیہ پیش کر رہے ہو۔ کسی کارِ خیر میں تمھاری نظر میں مخلوق کی خوشنودی نہ ہونی چاہیے۔

(۱۵) بادشاہ کا حق:

یہ ہے کہ تم یہ سمجھو کہ اس کے ذریعہ تمھاری آزمائش ہو رہی ہے اور وہ تمھارے ساتھ بندھا ہوا ہے اس لیے کہ اللہ نے اس کو تم پر سلطنت بخشی ہے۔ لہٰذا تمھارا فرض ہے کہ ایسا کام نہ کرو جس سے اس کو غصہ آ جائے۔

اس طرح تم خود کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔

(۱۶) اُستاد کا حق:

یہ ہے کہ اس کی تعظیم کرو اور اس سے علم و دانش حاصل کرو۔ ہر مجلس و محفل میں اس کا احترام کرو اور ہمہ تن گوش بن کر اس کی بات سنو۔ دیکھو کہ وہ کیا کہتا ہے اور اس کی باتوں کو جان و دل کے ساتھ خوش آمدید کہو۔ اس کی آواز پر آواز بلند نہ کرو۔ بس اسی بات کا جواب دو جو وہ تم سے دریافت کرے۔ اس کے درس میں بیٹھ کر سرگوشیاں نہ کرو، کسی کی غیبت نہ کرو اور کسی کو بُرا نہ کہو۔

(۱۷) کارفرما (حاکم) کا حق:

یہ ہے کہ اسکے حکم کی سرتابی نہ کرو، مگر اس وقت جب وہ تم کو حکم خدا کے خلاف حکم دے۔

(۱۸) محکوم کا حق:

یہ ہے کہ سمجھو کہ یہ سب تمھارے مطیع و فرمانبردار ہیں اس لیے کہ وہ تم سے کمزور اور مفلس ہیں۔ تم توانا اور صاحبِ حیثیت ہو اس لیے وہ تمھاری اطاعت کر رہے ہیں۔ لہٰذا تمھارا فرض ہے کہ ان کا لحاظ رکھو اور ان کے ساتھ عدل سے پیش آؤ۔ ان پر باپ کی طرح سے شفقت کرو۔ ان کی غلطیوں کو معاف کر دیا کرو۔ نادانی اور ناسمجھی کی وجہ سے اگر کوئی غلطی ہو جائے تو ان کی پکڑ نہ کرو۔ ان کے ساتھ عفو و درگزر بہترین خوبی ہے۔

(۱۹) شاگرد کا حق:

یہ ہے کہ تم یہ سمجھو کہ تم کو اللہ نے علم و دانش میں اس پر برتری دی ہے اور تمھیں اس کا سرپرست بنایا ہے۔ یہ علم و دانش جو تمھیں دیا گیا ہے تم اسے

دوسروں کو سکھاؤ۔ درحقیقت یہ اللہ کی امانت ہے اسے اس کے اہل کے سپرد کردو۔ اللہ نے اپنے علم کے لامتناہی خزانہ کا ایک دریچہ تم پر کھول دیا ہے اگر اس کے شکرانہ کے طور پر اس شرف و علم کا دروازہ تم دوسروں پر کھولو گے تو اس فیضانِ الٰہی کی روشنی تم کو اور زیادہ ملے گی۔ اگر اس کو چھپائے رکھو گے، جو کچھ تم جانتے ہو اس کو دوسروں کو بتانے میں دریغ کروگے اور علم و فضل کے طالبین کے سوال کو رد کروگے تو اللہ تعالیٰ یہ نعمت تم سے سلب کرلے گا۔

(۲۰) عورت کا حق:

یہ ہے کہ تم یہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے اسے تمھاری دلی آسودگی کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ بھی سمجھو کہ یہ نعمت تمھیں اللہ کی عنایت سے ملی ہے۔ اس کی قدر کرو اور اس سے رفق و محبت کا سلوک کرو، اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرو۔ اگرچہ تمھارا حق اس پر بہت ہے اور وجوب کی حد تک ہے مگر اس کا بھی حق ہے کہ تم اس پر مہربانی کرو۔ تم اس کا نان و نفقہ اور اخراجات دیتے رہو۔ اگر وہ جہالت کا مظاہرہ بھی کرے تو اسے معاف کردو اور اس پاک و سادہ روح کو دینی تعلیم و تربیت دو تاکہ وہ سلیقہ مند اور تمھارے مناسب حال ہو جائے۔

(۲۱) غلام اور خدمتگاروں کا حق:

یہ ہے کہ تم یہ سمجھو کہ وہ بھی خدا کے بندے اور اللہ کی مخلوق ہیں تمھارا اور ان کا گوشت و خون ایک ہی طرح کا ہے۔ تم نے انھیں خلق تو نہیں کیا ہے کہ جو چاہو ان کے ساتھ سلوک کرو۔ جس ذات نے تم کو پیدا کیا، اسی ذات نے اس کو بھی پیدا کیا ہے۔ اس میں تمھیں اس پر کوئی تفوق اور

برتری نہیں ہے۔ تم اس کو روزی بھی نہیں دیتے۔ خدا ہی تم سب کو روزی دیتا ہے۔ صرف اتنا ہے کہ امور دنیا میں اللہ نے تمھیں اس پر سلطنت و اقتدار دیا ہے تاکہ اس کے ذریعے تمھیں آزمائے۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا وجود احسان ہے نیک سلوک کرنے کے لیے۔ لہٰذا تم ان کے ساتھ نیک سلوک کرو اور اگر وہ تمھاری نظر میں بُرا ہے تو بدل دو مگر اسے رنج و تکلیف نہ دو۔

(۲۲) ماں کا حق:

یہ ہے کہ تم اس کو پہچانو کہ وہ کون ہے اور یہ جان لو کہ وہ ہی اپنے شکم میں تمھارا بوجھ اٹھائے رہی اور اپنے تمام احساسات اور قوتوں کے ساتھ تمھاری حفاظت کرتی رہی۔ تمھیں بھوک و پیاس سے بچانے کے لیے خود بھوک و پیاس برداشت کرتی رہی۔ خود برہنہ تن رہی مگر تم کو لباس پہنایا۔ خود دھوپ میں رہی مگر تم کو سایہ میں رکھا۔ تمھارے آرام کے لیے وہ خود جاگتی رہی مگر تمھیں سلاتی رہی۔ تمھارے لیے اس نے گرمی سردی بھوک پیاس اور طرح طرح کی تکلیفیں جھیلیں تاکہ تم اس کے فرزند سعید بنو۔ اس کے احسانات اتنے ہیں کہ ممکن نہیں کہ تم بغیر اللہ کی مدد کے اس کے احسانات کا بدلہ دے سکو یا اس کا شکریہ ادا کرسکو۔

(۲۳) باپ کا حق:

یہ ہے کہ تم اس کو اپنی اصل اور بنیاد سمجھو۔ اگر وہ نہ ہوتا تو تم بھی نہ ہوتے۔ یہ جو کچھ تم اپنے اندر دیکھ رہے ہو، یہ سب اسی کی وجہ سے ہے۔ تمھارا باپ تمھارے لیے نعمتِ اصلی ہے۔ تم اور یہ تمھارا سارا مال و دولت، سب اسی کی وجہ سے ہے اور تم اسی سے منسوب ہو۔ اگر تمھارے

اندر باپ کا شکریہ ادا کرنے کی طاقت ہے تو اللہ کا شکر ادا کرو۔ اور ویسے تو اللہ کے سوا اور کسی کے پاس قوت و طاقت نہیں ہے۔

(۲۴) فرزند کا حق:

یہ ہے کہ تم یہ سمجھو کہ وہ تم سے ہے اور تم سے وابستہ ہے۔ اچھا ہو یا بُرا، بہر حال تمھارا ہے اور اس کی پرورش کی ذمہ داری تم پر ہے۔ تم اسے خداشناسی کی تعلیم دو۔ اس کی دینداری کی ذمہ داری تم پر ہے۔ اس کے ساتھ نیکی اور احسان کرو تاکہ خدا سے اس کی جزا اور اس کا ثواب ملے یہ بھی سمجھ لو کہ اس کے ساتھ بدی کرکے تم خود عذاب میں مبتلا ہوگے۔ فرزند تمھارے درختِ حیات کا ایک پودا ہے۔ وہ تمھارے شجرِ زندگی کا پھل ہے بہتر ہے کہ اس کو خوشگوار بنا کر اس سے اپنا منہ میٹھا کرو۔

(۲۵) بھائی کا حق:

یہ ہے کہ یہ سمجھو کہ وہ تمھارا ہاتھ، تمھاری عزت، تمھاری قوت، تمھاری پشت، تمھاری پناہ ہوگا۔ بھائی کو ظلم اور معصیت کا ذریعہ نہ بناؤ۔ دشمن کے مقابلہ میں اس کی مدد کرو، اس کے بہی خواہ رہو بشرطیکہ وہ اللہ کا مطیع اور فرمانبردار ہو۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ اس سے زیادہ قابلِ احترام ہے اور اللہ کے سوا کوئی اور دانا اور توانا نہیں ہے۔

(۲۶) مالک کا حق:

یہ ہے کہ یہ سمجھو کہ اس نے تمھاری آزادی کے لیے اپنا مال صرف کیا ہے، تمھیں بندگی و غلامی کی ذلت سے نکالا ہے اور اطاعت کی قید سے چھڑایا ہے۔ یہ وہی ہے جس نے اسیری اور غلامی کا طوق تمھاری گردن سے اتار کر تمھیں رہا کرایا ہے تاکہ تم فارغ البالی کے ساتھ اللہ کی عبادت کرو۔

یہ سمجھ لو کہ وہ تمھارے ہر زندہ و مُردہ سے زیادہ تم پر حق رکھتا ہے۔ وہ تمھارے لیے سب سے بہتر ثابت ہوا ہے اور تمھارے جان و مال پر ترجیح رکھتا ہے۔ اگر وہ محتاج ہوجائے تو اس کی مدد کرو اگر کمزور ہوجائے تو اس کو سہارا دو۔ کیونکہ اللہ کے سوا کوئی توانا نہیں ہے۔

(۲۷) غلام کا حق:

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی آزادی کو تمھاری نجات کا وسیلہ بنایا ہے اور تمھارے اور جہنم کے درمیان اس کا ایک پردہ حائل کردیا ہے۔

(۲۸) مُحسن کا حق:

یہ ہے کہ اس کا شکریہ ادا کرو، اس کے احسان کو یاد رکھو اور اس کے حق میں اللہ سے دعا کرو۔ اگر ایسا کروگے تو گویا تم نے بظاہر و بباطن ہر طرح اس کا شکریہ ادا کردیا اور اس کے احسان سے سبکدوش ہو گئے۔ پھر اگر کبھی اللہ تمھیں طاقت دے تو اس کے احسان کا بدلہ اس کو دو۔

(۲۹) مؤذن کا حق:

یہ ہے کہ یہ سمجھو کہ وہ تمھیں اللہ کی یاد دلاتا ہے۔ اس کی عبادت اور اس کی حمد کی تمھیں دعوت دیتا ہے اور تم پر احسان کرتا ہے اس لیے تم بھی اس کے ساتھ نیک سلوک کرو اور اس کا شکریہ ادا کرو۔

(۳۰) پیش نماز کا حق:

تمھارے پیش نماز کا حق تم پر یہ ہے کہ یہ محسوس کرو کہ وہ پروردگار اور تمھارے درمیان ایک نمائندہ ہے۔ وہ تمھاری جانب سے خدا کو مخاطب کرتا ہے، تم اس کی جانب سے خدا کو مخاطب نہیں کرتے۔ وہ تمھارے لیے دعا کرتا ہے، تم اس کے لیے دعا نہیں کرتے۔ تمھارا پیش نماز اور تمھارا

امام جماعت اپنی جان کو پیش کرکے تمھاری جان بچاتا ہے لہٰذا اسی اندازہ کے مطابق تم بھی اس کو تحفظ فراہم کرو اور اس کا شکریہ ادا کرو۔

(۳۱) مصاحب کا حق:

یہ ہے کہ اس کے ساتھ نرمی اور ملائمت سے بات کرو اور مروت و انصاف سے کام لو اور اس سے اجازت لیے بغیر اپنی جگہ سے نہ اٹھو۔ اس کی لغزشوں کو بھول جاؤ، اس کی خطاؤں کو درگزر کرو، اس کی نیکیوں کو یاد کرو، اس کے لیے اچھے الفاظ منہ سے نکالو۔

(۳۲) ہمسایہ کا حق:

یہ ہے کہ اس کی غیر حاضری میں اس کے گھر کی حفاظت کرو اور اس کے حسبِ حیثیت اس کا احترام کرو۔ اگر اس پر کوئی ظلم ہو رہا ہے تو اس کی حمایت اور مدد کرو اور مشکل میں اس کو تنہا نہ چھوڑو۔ اس کی لغزشوں اور خطاؤں کو درگزر اور اس کی غلطیوں کو معاف کرو۔ اور بخوشی اور باوقار طور پر اس سے میل جول رکھو۔

(۳۳) رفیقِ سفر کا حق:

یہ ہے کہ کرم و انصاف کے ساتھ اس کے ہمسفر رہو اور کرم و احسان میں اس کو اپنے سے آگے نہ بڑھنے دو۔ اس کو اسی طرح دوست رکھو جس طرح وہ تم کو دوست رکھتا ہے اور اگر وہ کسی گناہ کا ارادہ کر رہا ہو تو اس کو روکو۔

(۳۴) شریکِ کار کا حق:

یہ ہے کہ اگر وہ غیر حاضر ہے تو مشترکہ کام کو اس کی طرف سے بھی انجام دے دو اور اگر وہ موجود ہے تو اس کے شریکِ کار رہ کر اس کو خوش

رکھو۔ اس کی مرضی کے خلاف کوئی حکم نہ دو۔ بغیر اس کے مشورہ کے اس میں اپنے لیے کوئی کام نہ کرو۔ اس کے مال کی حفاظت کرو۔ مال کے کم و بیش ہونے میں بددیانتی نہ کرو۔ اس لیے کہ جب تک دونوں شریکِ کار ایک دوسرے کے ساتھ بددیانتی نہ کریں گے اللہ کا ہاتھ ان کے ساتھ ہوگا۔ (اور اس میں برکت ہوگی)

(۳۵) مال کا حق:

یہ ہے کہ اسے بذریعہ حلال حاصل کرو اور مباح و حلال مصرف میں خرچ کرو اس میں سے بخشش کرو اور بخشش کرنے میں بخل نہ کرو۔

(۳۶) طالبِ امداد کا حق:

یہ ہے کہ اگر تمھارے پاس ہے تو اسے دے دو اور اگر نہیں ہے تو میٹھی زبان اور مناسب گفتگو سے اس کو خوش کرو اور نرمی کے ساتھ اس سے وعدہ کرو۔ یہ مناسب نہیں کہ اس غریب کو غلط وعدے دے کر زیادہ دوڑاؤ۔ غلط وعدے سے یا ترش بات کرکے اسے رنج نہ پہنچاؤ۔

(۳۷) دوست و ہمدم کا حق:

یہ ہے کہ اس سے مکاری نہ کرو، اس کو فریب نہ دو اور آپس کے میل ملاپ میں دھوکہ و فریب و حیلہ نہ کرو۔ اس کے معاملہ میں خدا سے ڈرو اور محتاط رہو۔ اس کی تکذیب نہ کرو۔ اس سے مخاصمانہ رویہ نہ رکھو۔ اگر وہ تم سے بدگمان ہے تو اس کی بدگمانی دور کرو اور باہم افہام و تفہیم سے کام لو۔

(۳۸) مخاصم و دشمن کا حق:

یہ ہے کہ اگر وہ سچ بول رہا ہے تو تم گواہی دو کہ یہ سچ کہتا ہے۔ اس پر ظلم نہ کرو اور اس کا حق اس کو دے دو۔ اور اگر اس کا دعویٰ غلط ہے

تو دلجوئی سے کام لو اور اس کے جواب میں تند گفتگو نہ کرو۔ غصہ میں نہ آؤ، غیظ و غضب نہ اختیار کرو اور خدا کے لیے اس پر بھڑک نہ اٹھو بلکہ ذکرِ خدا اور حقیقتِ حال کی طرف اس کی رہنمائی کرو۔ اس کی غلط فہمی یا لغویت کو نرمی کے ساتھ سمجھاؤ۔ یہ مناسب نہیں کہ اگر کسی کو غلط فہمی یا اشتباہ ہوگیا ہے تو اس قدر خشونت برتی جائے کہ دشمنی اور مخاصمت کا سبب بن جائے۔

(۳۹) مدعی کا حق:

یہ ہے کہ اگر تم حق پر ہو تو نرمی سے کام لو، اس سے مختصر بات کرو، سختی اور ضد سے کام نہ لو اور اگر تم حق پر نہیں ہو تو خدا سے ڈرو، توبہ کرو، اور غلط دعویٰ نہ کرو۔

(۴۰) مشورہ چاہنے والے کا حق:

یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو اسے درست رائے دو، ورنہ اسے کسی ایسے شخص کا پتہ دو جو اس کام کا ماہر ہو اور تم سے بہتر مشورہ دے سکے۔

(۴۱) مشورہ دینے والے کا حق:

یہ ہے کہ اگر وہ تمھارے نظریہ کے خلاف رائے دے تو اس کو بُری نظر سے نہ دیکھو، اس سے بدگمان نہ ہو جاؤ اور اگر تمھارے نظریہ کے مطابق رائے دے تو خدا کا شکر ادا کرو۔ اس لیے کہ ہر شخص کا اپنا اپنا خیال اور اپنا نظریہ ہے۔ خیال میں توافق یا عدم توافق دشمنی یا بداندیشی کا سبب نہیں ہونا چاہیے اور ہر حالت میں مشورہ دینے والے کی بات کا احترام کرنا چاہیے۔

(۴۲) نصیحت چاہنے والے کا حق:

یہ ہے کہ اس کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ۔ اس کی باتوں کو سنو۔ وہ

اچھی بات کہتا ہے یا بُری، ہر حال میں اس کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ۔ اس لیے کہ جتنی اس کی سمجھ ہے اس کے مطابق اس نے بات کہی ہے۔

(۴۳) ناصح کا حق:

یہ ہے کہ اس کا شکریہ ادا کرو۔ الغرض اگر کسی ناصح نے تمھیں نصیحت کی مگر اپنی جہالت کی وجہ سے غلط نصیحت کر رہا ہے، تو خفا نہ ہو اور اس سے مواخذہ نہ کرو بشرطیکہ وہ تم پر تہمت نہ لگا رہا ہو۔

(۴۴) بڑوں، بزرگوں کا حق:

یہ ہے کہ ان کا احترام کرو، اس لیے کہ وہ عمر اور دنیاوی تجربہ میں تم سے آگے ہیں۔ ان سے جنگ نہیں کرنا چاہیے، ان سے اچھا سلوک کرو اور راستہ چلنے میں ان سے آگے نہ چلو۔

(۴۵) اپنے سے چھوٹوں کا حق:

یہ ہے کہ ان کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ۔ ان کو علم و ہنر سکھاؤ۔ ان سے درگزر کیا کرو۔ ان کی عیب پوشی کیا کرو۔ ان پر کرم کیا کرو اور اگر کوئی شکایت ہے تو اسے حکایت کے انداز سے بیان کرو تاکہ وہ اپنے بلوغِ عقل کے ساتھ اپنے نقص کو دور کریں۔

(۴۶) سائل کا حق:

یہ ہے کہ اس کی ضرورت کے مطابق اس کو دو کہ اس کی دعا تمھارے مال کی کمی کو پورا کر دے گی۔ سائل تمھارے اور تقرب الٰہی کے درمیان ایک واسطہ ہے۔

(۴۷) مسئول کا حق:

یہ ہے کہ اگر وہ تمھاری درخواست کو وقعت دے تو احترام کے

ساتھ اس کا شکریہ ادا کرو اور اگر معذرت خواہ ہے تو اس کے عذر کو قبول کرو۔ شاید واقعتاً اس کو کوئی مشکل ہو کہ جس کی وجہ سے تمھاری درخواست قبول نہیں کر سکتا۔

(۴۸) بدسلوکی کرنے والے کا حق:

یہ ہے کہ اس کو معاف کر دو بشرطیکہ یہ معافی اس کو بدسلوکی کرنے پر اور جری نہ کر دے۔

(۴۹) برادرانِ دینی کا حق:

یہ ہے کہ ان کی صحت و سلامتی اور رحمت و نعمت الٰہی کے لیے صمیم قلب سے دعا کرو اور ان کے ساتھ رفق و نرمی، الفت و محبت، بہی خواہی، شکر و احسان کا سلوک کرو اور ان سے آزار و اذیت کو، خواہ تمھاری طرف سے ہو یا کسی اور کی طرف سے، روکو۔

(۵۰) اہلِ ذمہ کا حق:

یہ ہے کہ اللہ نے ان کو قبول کیا ہے تو تم بھی انھیں قبول کرو اور خدا سے تم نے جو عہد کیا ہے اس پر قائم رہو اور اسے پورا کرو۔ ان پر ظلم و ستم نہ کرو اور یہ سمجھو کہ یہ لوگ تمھاری پناہ میں ہیں اور تمھارے پاس امانت ہیں۔ ضروری ہے کہ یہ ظلم و زیادتی سے محفوظ رہیں۔

امامؑ کا اپنے منشور پر عمل

امام علیہ السلام نے خود اپنے عمل سے اپنے منشور میں جان ڈالی اور اسے حیات بخشی۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آپؑ نے اس سلسلہ میں کیا کیا تاکہ اس سے سبق حاصل کیا جائے۔

حق اللہ کی ادائیگی

خدا کا حق ادا کرنے اور اس کی یکتائی کا اقرار کرنے کے سلسلہ میں آپؑ کا کلام انسانیت کا سب زیادہ گرانقدر اور پرشکوہ کلام ہے۔ آپؑ کا کلام ایک ایسی ہستی کا کلام ہے جو مخلوق سے بالکل کٹ کر اپنے خالق سے جا ملا ہو۔ آپؑ کا کلام حضرت امیر المومنینؑ کے کلام سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ وہی حسنِ کلام اور وہی اندازِ بیان۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ امامؑ نے خدا کا حق کیونکر ادا کیا تاکہ اس سے سبق حاصل کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ خدا کا حق اس کی حمد ہے، اس کی توحید کی معرفت ہے اور یہ مسلّم ہے کہ بغیر زاد و توشۂ حمد کے اس پروردگار کی بارگاہ میں پہنچنا ممکن نہیں۔

امام علیہ السلام شب کی تاریکیوں میں اللہ سے لَو لگاتے ہیں اور اس کی حمد و ثنا یوں کرتے ہیں:

"حمد اُس خدا کی جو مجھے اس طرح درگزر کرتا ہے کہ اب میرا کوئی گناہ نہیں رہ گیا۔ میرا پروردگار میرے نزدیک ہر شے سے زیادہ محبوب اور ہر چیز سے زیادہ لائقِ ستائش ہے۔ اس خدا کی حمد کہ میں صرف اسی سے اُمید رکھتا ہوں اور کسی غیرِ خدا سے امید نہیں رکھتا۔ اگر غیرِ خدا سے اُمید رکھوں تو میری اُمید کبھی پوری نہ ہوگی۔ اس خدا کی حمد جس نے دن اور رات اپنی قدرت سے پیدا کیے اور اپنی قدرت ہی سے دونوں کو جدا جدا کیا۔ پھر ان میں سے کبھی ایک کو گھٹاتا ہے اور دوسرے کو بڑھاتا ہے۔ پھر اس بڑھے ہوئے حصے کو لے کر دوسرے کو دیتا ہے اور دونوں کو برابر کر دیتا ہے۔ اس خدا کی حمد جس نے ہم لوگوں کو اپنی ذات سے شناسا کرایا اور بذریعہ الہام شکر کی تعلیم دی۔ ہم پر معرفت کے دروازے کھولے جس سے ہم نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا۔ اس نے اپنی خالص توحید کی طرف ہم لوگوں کی رہنمائی کی۔ ہمیں انکار اور

شک سے دور رکھا۔ ایسی حمد کہ جب تک زندہ رہوں اس کی حمد کرنے والوں میں شمار ہوتا رہوں اور جب مدتِ حیات ختم ہو جائے تو اس کی رضا اور عفو کی طرف کوچ کر جاؤں۔

اے پروردگار! تو جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ جسے چاہے عذاب دے اور جسے چاہے اپنی رحمت سے نوازے، جس چیز سے چاہے اور جس طرح چاہے۔ نہ کوئی تجھ سے بڑا ہے کہ تیرے عمل پر باز پرس کرے اور نہ کسی میں اتنی ہمت و طاقت ہے کہ تیری سلطنت اور بادشاہت کا دعویدار بنے۔ تو اپنی حکمرانی میں نہ کسی کو شریک کرتا ہے اور نہ اپنے حکم میں کسی کو اپنا مخالف اور مدمقابل گردانتا ہے۔ سارا حکم فقط تیرے لیے ہے۔ تو ہی سب کا خالق ہے اور تو ہی سب سے بڑا ہے۔ ہر طرح کی بُرائیوں سے پاک، ہر عیب و نقص سے بَری اور تمام تعریفوں سے بالاتر ہے۔

اس کا شکر اور اس کی ہر اس نعمت پر شکر جو اس نے ہمیں اور تمام بندوں کو دی ہے یا آئندہ دے گا۔ اس کی ہر نعمت پر اتنا شکر کہ جس کا اندازہ اور علم خود اس کو ہے اور وہ بھی مسلسل تا روزِ قیامت۔

اے وہ ذات کہ جس کی حمد، خود حمد کرنے والوں کو نجات

دلاتی ہے، اے وہ ذات کہ جس کی اطاعت خود اطاعت کرنے والوں کو رستگار کرتی ہے، تو رحمت نازل فرما محمدؐ اور ان کی آل پر۔ تو ہمارے دل کو اپنی یاد کے لیے دوسروں کی یاد سے خالی کر دے۔"

یہ کلام اس کا ہے کہ جس نے سارے مصائب و آلام جھیلے۔ یہ کلام اس کی خدا پرستی اور عظیم روحانیت کو ظاہر کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ حق اللہ کو ادا کرنے کے لیے کس طرح اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ وہ بارگاہِ الٰہی سے مدد کے طالب ہیں تاکہ وہ اس اہم کام میں بندے کی مدد کرے۔

کیا آج تک کسی نے اس طرح سے اللہ کی حمد کی ہے؟ کیا کسی نے اس طرح سے اس کی حمد اور کبریائی کے لیے لب کھولے ہیں؟

امامؑ کا یہ کلام بہت محکم اور مضبوط ہے اور سوائے اس طریقہ کے اور بھلا کس طریقہ سے اللہ کی معرفت یا اس کی حمد ممکن ہے۔

حقوقِ نفس کی ادائیگی

نفس کے حق کی ادائیگی کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اعضائے بدن سے درست راہ میں کام لیا جائے۔ اس کی باگ ڈور خواہشاتِ نفسانی کے ہاتھوں میں نہ دی جائے بلکہ اس کو عقل کے زیرِ تسلط رکھا جائے۔ امام علیہ السلام اس حقیقت کے کامل نمونہ ہیں۔ وہ ہمیشہ خدا کے ہو کے رہے۔ انھوں نے خود کو خدا کے سپرد کر دیا تھا۔ ہمیں چاہیے کہ ان سے سبق حاصل کریں اور دیکھیں کہ معصومین علیہم السلام خود کیا کرتے ہیں اور ہم لوگوں سے کیا چاہتے ہیں تاکہ ہم لوگ ان کے راستے پر چلیں۔

جب امام علیہ السلام اپنی مناجات میں نفسِ انسانی کے متعلق ایسی مناسب گفتگو کرتے ہیں تو کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ اس طرح ہم لوگوں کو نصیحت فرما رہے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ:

"اے نفس! تو حیات و زندگانیٔ دُنیا سے کتنی اور کب تک دل بستگی رکھے گا اور کب تک اس دُنیا اور یہاں کی تعمیر پر اعتماد کر کے اس کی طرف مائل رہے گا۔ کیا تو عبرت حاصل نہیں کرے گا، اپنے گزرے ہوئے آباؤ اجداد سے اور اپنے ان دوستوں سے جن کو زمین نے اپنے اندر چھپا لیا ہے اور اپنے ان بھائیوں سے جنھیں تو نے مصیبت میں مبتلا پایا ہے اور اپنے ان ہمعصروں سے جنھیں تو نے خود سپرد خاک کیا ہے، کہ وہ اب زمین کے اندر ہیں جبکہ اس سے پہلے وہ روئے زمین پر تھے۔ ان کے اعضا گل گئے۔ اب ان کے گھر اور ان کے گھر کے صحن ان سے خالی ہیں۔ مقدرات نے ان کو موت کے سپرد کر دیا۔ وہ دنیا سے رخصت ہو گئے اور جو کچھ جمع کیا تھا وہ سب یہیں چھوڑ گئے اور قبر میں پنہاں ہو گئے۔"

کیا عالمِ وجود نے کبھی ایسے لوگوں کو پیدا کیا ہے جنھوں نے آلِ محمدؐ کی طرح اپنی زبان سے راہِ حق میں یوں کلام کیا ہو؟ اس شدید ترین طوفانی دور میں کہ جس میں تاریخ دنیا اسلامی قانون و دستور کے فنا ہونے کی گواہ بننے جا رہی تھی، امام زین العابدینؑ کا کلام اسلام کی نصرت میں آگے

بڑھ رہا تھا۔

ظلم و ستم و خباثت سے جنگ کے لیے اُن حربوں کی ضرورت ہے جو نیزہ و شمشیر سے زیادہ تیز ہوں۔ لہٰذا امامؑ نے باوجود اس کے کہ دیکھ رہے تھے کہ موت کی تلوار سامنے کھنچی ہوئی موجود ہے، حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے اپنی زبان سے کام لیا اور حقیقت بیان کی۔ آپ کبھی اس پر تیار نہیں ہوئے کہ اس اسلحہ کو چھوڑ دیں۔ انھوں نے اپنی زبان کو بہترین کلام کے لیے استعمال کیا۔ آپ کا کلام اتنا موزوں اور مناسب ہے کہ اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔

انسان کی پوری تاریخ میں یہی نظر آئے گا کہ انسان تکلیف سے بچنا اور آرام کے زیرِ سایہ رہنا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ زندگی کی سختیوں اور مصیبتوں میں یہ بھی ممکن ہے کہ انسان موت کے مُنہ میں پہنچ جائے۔ لہٰذا آرام کے زیرِ سایہ رہنے میں اس کا تحفظ ہوتا ہے۔ یہ بھی مسلّم ہے کہ انسان کا دلی مقصد کسی نہ کسی طرح اس کے کلام سے واضح ہو جاتا ہے اور یہ بھی طے ہے کہ بعض انسان اپنے کلام ہی سے عظیم اور بعض انسان اپنے کلام ہی سے مُردہ اور بے جان سمجھے جاتے ہیں۔ مگر دنیائے اسلام کی نامور شخصیتوں کے کلام اور ان کے پوشیدہ نکات اور معاشرہ کی اصلاح کے بنیادی اسباب جو اس میں ودیعت ہیں، ابھی تک جتنا چاہیے دریافت نہیں ہوئے ہیں۔ زمانہ موقع ہی نہیں دیتا کہ لوگ ان کے کلام کے مضمرات تک پہنچ سکیں حالانکہ امام زین العابدینؑ کا کلام لطافت میں شبنم سے زیادہ لطیف، پائیداری میں پہاڑ سے زیادہ پائیدار اور سلاست میں پانی سے زیادہ رواں ہے۔

زبان کے حق کی ادائیگی

وہ کبھی بھی سچی اور درست بات کے علاوہ کچھ اور گوارا نہیں کرتے تھے اور کیوں نہ ہو، بچپن میں یا تو پیغمبرؐ کی احادیث سنیں یا ان لوگوں کے اقوال سُنے جو درسِ محمدؐ کے تربیت یافتہ تھے یا پھر قرآنی آوازیں جو خاندانِ رسالت میں ہر طرف سے بلند ہوتی رہتی تھیں۔ اس کے بعد تھوڑا سا اپنے جدِ بزرگوار کا جرأتمندانہ کلام سُنا جو دل کی گہرائیوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ لہٰذا جب منصبِ امامت پر فائز ہوئے تو اس کے لیے تیار نہ تھے کہ غلط باتوں کو سُنیں اور گوارا کریں۔ اس وقت مخالف حکومت کی طرف سے کذب و دروغ کی تشہیر و اشاعت ہو رہی تھی۔ ان تمام تر سختی سے سخت پابندیوں کے باوجود آپؑ صدق و راستی لوگوں کے کانوں تک پہنچا رہے تھے۔

آنکھ کے حق کی ادائیگی

آنکھ کا حق یہ ہے کہ محرمات پر نظر نہ ڈالی جائے۔ اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کے عمل و کردار میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں کیونکہ یہ اوصیائے دین خود دین کی عزت ہیں۔ محرمات کی طرف متوجہ ہونا تو درکنار، بنیادی طور پر انھیں بدی کا خیال تک نہیں آسکتا۔ محرمات کے دیکھنے کا کیا سوال ہے۔ پھر بھی امام علیہ السلام اسرارِ قدرت پر نگاہ رکھ کر آنکھ کا بہتر حق ادا فرماتے ہیں۔ چنانچہ اپنی مناجات میں مخلوقات، جیسے چاند و سورج وغیرہ جو اجزائے مادہ ہیں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے خالق کی طرف متوجہ ہو کر فرماتے ہیں:

"(اے ہلال) اے اللہ کی فرمانبردار و تیز رفتار مخلوق جو اپنی مقررہ منزلیں طے کرتی ہے اور نظام قدرت کے ماتحت آسمان پر گردش کرتی رہتی ہے میں ایمان رکھتا ہوں اس ذات پر جس نے تیری چاندنی کے ذریعہ اندھیرے کو اجالا بنایا اور تیرے نور سے ہر نہاں کو آشکارا کیا۔ اس نے تجھ کو اپنی حکومت کی علامت اور اپنی سلطنت کی نشانی قرار دیا۔ تجھے اللہ نے کچھ اس قسم کا بنایا کہ تو کبھی بڑھے، کبھی گھٹے، کبھی طلوع ہو کبھی غروب، کبھی تجھ سے روشنی ہو اور کبھی تو گہن میں آجائے۔ اور ہر حال میں تو اس کا فرمانبردار ہے"

کون سی آنکھ ہے جو ان اجرام سماوی پر اس خوبی سے نظر ڈال سکے۔

ہاتھ کے حق کی ادائیگی

امامؑ کی دنیا بخشش و سخاوت اور کھلے ہاتھ والوں کی دنیا ہے۔ آپؑ کا دسترخوان ہمیشہ بچھا رہتا۔ آپؑ کا ہاتھ گرتے ہوئے لوگوں کے لیے پناہ اور سہارا تھا۔ مال و منال دنیا میں سے آپؑ کے پاس جو کچھ ہوتا سب بخش دیتے۔ اپنی فکر نہ کرتے اور جو کچھ رکھتے وہ دوسروں کو دینے کے لیے رکھتے اس لیے سارے اہل احتیاج کی نگاہیں آپ کی طرف اٹھتیں۔

ایک مرتبہ آپؑ ایک ایسے شخص کے پاس گئے جو جانکنی کے عالم میں تھا اور مقروض ہونے کی وجہ سے رو رہا تھا۔ امامؑ نے اس کا ہزاروں کا قرض اپنے ذمے لیا۔

کنیزوں اور غلاموں کو آزاد کرتے وقت ان پر اپنا سرمایہ خرچ کرتے۔ انھیں مکان، زمین اور کسب معاش کے دیگر وسائل بھی عطا فرماتے۔ آپ بے شمار خاندانوں کے اخراجات کے متکفل تھے۔ سینکڑوں خاندانوں پر شب و روز بخشش و عطا ہوتی اور ان کے اخراجات کے ذمہ دار ہوتے۔

مشہور شاعر فرزدق نے آپ کی مدح میں قصیدہ کہا تو امامؑ نے کئی ہزار درہم بطور صلہ اس کے پاس بھیج دیے۔ اور بارہا اپنا سارا سرمایہ خدا کی راہ میں دے دیا۔ اور اس کے علاوہ بھی بخششیں کرتے رہے۔

پاؤں کے حق کی ادائیگی

امام زین العابدین علیہ السلام ہر انسان سے زیادہ سچائی کی راہ پر گامزن تھے۔ ہمیشہ ان مقامات پر جایا کرتے جہاں انھیں حق گوئی اور حق بیان کرنے کا موقع مل سکے۔ مسجد میں آتے، منبر پہ بیٹھتے اور خانہ کعبہ کی طرف حج و عمرے کے لیے جاتے۔ حسینی قافلہ کے ساتھ میدان کربلا میں قدم رکھا اس لیے کہ یہ مقدس ترین مقام ہونے والا تھا۔ پھر اپنے پدر بزرگوار کے فلسفۂ شہادت کی اشاعت و تبلیغ کے لیے شہر کوفہ اور شہر دمشق گئے۔ اور اس طرح آپ نے ہمیشہ مناسب اور درست راہ میں قدم رکھا۔

شکم کے حق کی ادائیگی

پیٹ کا حق یہ ہے کہ اکل حرام سے پرہیز کیا جائے اور حلال سے

بشکم کو سیر کیا جائے۔ پیٹ کا حق یہ بھی ہے کہ خود سیر ہو اور دوسروں کو سیر کرے۔ امام زین العابدین علیہ السلام طرح طرح کے کھانوں سے بھرے ہوئے دسترخوان بچھاتے تاکہ دوسروں کو سیر کریں مگر خود سادہ ترین غذا پر اکتفا فرماتے اور صرف اتنا کھاتے کہ طاقت باقی رہے۔ اپنی دودھ پلانے والی دایہ کے ساتھ کھانا تناول نہ فرماتے صرف اس ڈر سے کہ جو لقمہ اٹھایا جارہا ہے ممکن ہے کہ دایہ کی اس پر پہلے سے نظر رہی ہو۔

ہاں وہ حلال کے سوا کچھ نہیں کھاتے تھے اور اس پر وہ ہمیشہ اپنے پروردگار کا شکر ادا کرتے۔

فرماتے تھے:

"شکر اس خدا کا جس نے ہمیں کھانا کھلایا اور پانی پلایا اور جو کچھ آمدنی ہوئی وہی ہمارے لیے کافی ہوگیا۔ ہر حال میں اس نے مجھے پناہ اور نعمتیں دیں۔ پروردگارا یہ نعمت تیرا لطف و کرم و بخشش و احسان ہے۔ اب اسی نعمت میں برکت دے اور میرے لیے لذیذ بنا دے، نیز ایک کھانے کے بعد دوسرے کھانے کے شکر کی مجھے توفیق عطا فرما"

آلِ محمدؐ کی طہارت و عصمت و عزت پر تاریخ گواہ ہے۔ اور تاریخ کو چھوڑیے اب اس سے بڑھ کر ہمارے اس قول کی تائید اور گواہی کیا ہوگی کہ خود اللہ تعالٰی نے اہلبیتِ رسولؐ کی طہارت کی گواہی دی ہے اور انھیں ہر طرح کی نجاست سے دور رکھا ہے۔ یہ حضرات

تقویٰ و طہارت و عفت کے نمونۂ کامل ہیں۔

حقِ نماز کی ادائیگی

نماز مخلوق کا اپنے خالق سے ارتباط کا بہترین وسیلہ ہے۔ اور امامؑ جن کی ہر شے خدا کے لیے اور ہر کام اللہ کی مرضی کے ساتھ ہے، اس بہترین وسیلۂ ارتباط سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی لیے جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو ایک دوسرے قسم کے انسان بن جاتے ہیں اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد دوسرے۔ آپؑ اپنی عبادت سے اپنے خالق کی نشاندہی اس طرح کرتے ہیں کہ حالتِ نماز میں لرزہ براندام ہوجاتے ہیں۔ آپؑ کے چہرے کا رنگ دگرگوں ہوجاتا ہے۔ ایک باریک پتے والے درخت کی مانند کہ ذرا ہوا چلی اور وہ ہلنے لگا اور اس کی پتیاں اور شاخیں حرکت میں آگئیں ایسا متواضع انسان جب خدائے قہار کے سامنے کھڑا ہوتا تو ایسے خضوع و خشوع سے کام لیتا کہ معلوم ہوتا کہ جیسے کوئی جانکنی کے عالم میں ہے اور اب اس نماز کے بعد تو زندہ مل ہی نہیں سکتا۔ جب آپؑ نماز کے لیے وضو فرماتے تو چہرے کا رنگ اڑ جاتا۔ لوگوں نے آپؑ سے اس کا سبب دریافت کیا تو آپؑ نے فرمایا:

---

[1] حضرت امام جعفر صادقؑ اپنے پدر بزرگوار حضرت امام محمد باقرؑ سے حدیث بیان فرماتے ہیں کہ حضرت علی ابن الحسینؑ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے کسی درخت کا تنہ ہو کہ جس کو کوئی جنبش نہ ہو مگر اس وقت جب ہوا چلے اور اس کی شاخیں اور پتے ہلنے لگیں۔ ناسخ التواریخ مجلد حضرت سجاد جزء ۱ صفحہ ۱۸۴

[2] منتہی الآمال جلد ۲ صفحہ ۷

"افسوس ہے تم لوگوں پر۔ کیا تمھیں یہ نہیں معلوم
کہ میں کس خدا کے سامنے کھڑا ہونے جارہا ہوں
اور میں اس کونسی عظیم ہستی سے گفتگو کرنے کے
لیے تیار ہو رہا ہوں"۔[۱]

آپؑ اتنی نمازیں پڑھتے کہ مواضع سجود پر بڑے اور دبیز گھٹے پڑجاتے جو سال میں کئی بار تراشے جاتے تھے اور اسی بنا پر آپؑ کو لوگوں نے 'ذوالثفنات' کا لقب دے دیا تھا اور انھیں 'سجاد' بھی کہا کرتے تھے۔

یقین کیجیے جب وہ نماز میں اپنے خالق کے سامنے کھڑے ہوتے تو تمام دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوجاتے اور اس سلسلہ میں آپؑ کے متعلق بہت سے واقعات منقول ہیں۔

ایک دن آپؑ نماز میں مشغول تھے کہ اتفاقاً مکان میں آگ لگ گئی ایسے موقع پر فطرتِ انسانی کا تقاضہ ہے کہ ہر انسان پریشان ہوجاتا ہے۔ لیکن امامؑ ان تمام حالات سے بے خبر اپنی نماز میں مشغول رہے اور نماز ترک نہیں کی، اس لیے کہ آپؑ کے پیشِ نظر دوزخ کی آگ تھی۔[۲]

ایک مرتبہ آپؑ نماز میں مشغول تھے کہ آپؑ کا کوئی کمسن بچّہ کنوئیں میں گر گیا۔ اہل خانہ نے شور مچایا مگر آپؑ نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

آپؑ کی اس شدّتِ عبادت اور کثرتِ نماز کی وجہ سے لوگ آپؑ کے حالات کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپؑ کے ایک محب و دوستدار

---

[۱] منتہی الامال جلد ۲ صفحہ

[۲] ملاحظہ ہو منتہی الامال

حضرت جابر ابن عبداللہ انصاریؓ آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کثرتِ عبادت کا سبب پوچھا۔ آپؑ نے جواب دیا کہ:

"پیغمبرِ اسلامؐ بھی تو اپنے مقام و مرتبہ کو جانتے تھے مگر
اتنی عبادت کرتے تھے کہ آپؐ کے پاؤں پر ورم آجاتا تھا
تو پھر میں اپنے جدّ و پدر کی سیرت کو کیسے چھوڑ دوں"۔

اور جب لوگ آپؑ کو اس کثرتِ عبادت سے منع کرتے تو آپؑ اپنے جد حضرت امیرالمومنینؑ کی عبادت کو یاد کرتے اور فرماتے کہ میں کیا چیز ہوں میرے جدّ جتنی عبادت تو کوئی کر ہی نہیں سکتا۔

امامؑ کی عبادت اور نماز کا یہ حال تھا کہ لوگ کبھی انھیں سیّدالعابدین کہتے، کبھی زین العابدین کہتے اور کبھی زین العباد کے نام سے یاد کرتے۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

"میرے پدر بزرگوار علی ابن الحسینؑ جب بھی کسی اللہ کی
عطا کردہ نعمت کو یاد فرماتے تو سجدۂ شکر ادا کرتے
اور پھر اس نعمت کے متعلق قرآن کی آیت کی تلاوت
فرماتے تو سجدۂ شکر بجا لاتے۔ جب بھی کسی مصیبت
یا کسی نقصان سے اللہ ان کو بچاتا تو اس کی حمد کرتے
اور شکر کا سجدہ کرتے، جب بھی کسی دشمن کی ایذا
رسانی سے اللہ ان کی حفاظت کرتا تو پیشانی سجدۂ شکر
میں رکھ دیتے، جب بھی نمازِ واجب سے فارغ ہوتے
تو سجدۂ شکر ادا کرتے اور جب بھی دو آدمیوں کے
اختلافات کو ختم کراتے اور ان میں صُلح و صفائی کرا دیتے

تو سجدۂ شکر کرتے۔ آپؑ کے تمام مواضع سجدہ پر سجدہ کا نشان صاف نظر آتا۔ اسی لیے آپ کا نام سجاد ہو گیا تھا۔" [۱]

آپؑ کی کثرتِ عبادت کے متعلق زرارہ ابن اعین کہتا ہے کہ اندھیری راتوں میں سے ایک رات کو میں نے ایک جانب سے یہ آواز سنی کہ:

"وہ کون لوگ ہیں جو دنیا سے کنارہ کش ہیں اور آخرت کی طرف مائل ہیں؟"

دوسری جانب سے یہ آواز آئی کہ:

"ایسی ذات تو صرف علی ابن الحسینؑ کی ہے" اور یہیں ان دونوں میں سے کوئی شخص نظر نہ آیا۔ [۲]

آپؑ صرف دنیا ہی میں نہیں بلکہ آخرت میں بھی زین العباد ہیں۔ چنانچہ حضرت رسول اکرمؐ سے روایت ہے کہ:

"قیامت کے دن ایک ندا دینے والا ندا دے گا کہ کون عبادت کرنے والوں کی زینت ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت میرا فرزند علی ابن الحسینؑ اہلِ محشر کی صفوں کو چیرتا ہوا بڑے وقار و سکون کے ساتھ قدم آگے بڑھائے گا۔" [۳]

---

۱ ناسخ التواریخ جزو ۱ حضرت سجاد صفحہ ۲۴

۲ حدیقۃ الشیعہ، مقدس اردبیلی، صفحہ ۵۱۶

۳ ناسخ التواریخ۔ جزو ۱ حضرت سجاد۔ صفحہ ۲۳

حقِ حج کی ادائیگی

حج اللہ تک رسائی کا ذریعہ ہے، حج تکمیلِ نفس ہے اور امام علیہ السلام نے بارہا زیارتِ خانہ کعبہ کے لیے جا کر اس سفر کی بلند حیثیت کو واضح فرمایا۔

مراسمِ حج کی ادائیگی کے لیے جب آپؑ لباسِ احرام زیبِ تن فرماتے تو جسم کانپنے لگتا، چہرہ زرد ہو جاتا اور خانہ کعبہ کے سامنے دعا کے لیے ہاتھ بلند کرتے اور اللہ کی بارگاہ میں زار و قطار گریہ فرماتے۔ آپؑ کو روتا ہوا دیکھ کر لوگ سوال کرتے کہ ایک تو آپ بذاتِ خود صفاتِ حسنہ کے مالک ہیں، پھر اولادِ رسولؐ ہیں اور اس کے علاوہ اللہ سے رحم کی امید رکھنی چاہیے، پھر اس قدر کیوں روتے ہیں۔

امامؑ فرماتے ہیں کہ:

"اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ روزِ قیامت کسی کا حسب نسب کام نہ آئے گا۔ اس لیے صرف اولادِ رسولؐ ہونا کسی کو سزا سے نہیں بچا سکتا۔"

امامؑ فرماتے ہیں کہ:

"اللہ کی بارگاہ میں شفاعت صرف انھیں لوگوں کے حق میں قبول ہوگی کہ جن کے لیے اس نے شفاعت کی اجازت دی ہو اور پھر اللہ صرف نیکو کاروں ہی کو اپنی عطا و کرم کے لائق سمجھتا ہے۔"

آپؑ یہ سب باتیں فرماتے ہیں حالانکہ قیامت کے دن شفاعت کرنے

والوں میں سے آپؑ خود بھی ہیں مگر آپؑ امت کی رہنمائی کے ہر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی زندگی کے دستور کو دوسروں کے لیے نمونہ بناتے ہیں۔

اپنے مکہ کے سفروں میں کبھی اپنے اونٹ کو تازیانہ نہیں مارتے تھے بلکہ جب دیکھتے تھے کہ یہ تھک گیا ہے تو اسے تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیتے تھے تاکہ اپنی تھکن دُور کرلے۔ سفرہائے مکہ میں ہمیشہ آپؑ ایسے گروہ کے ساتھ سفر فرمایا کرتے تھے جو آپؑ کو پہچانتے نہ ہوں اور ان لوگوں سے یہ عہد و پیمان ہوا کرتا کہ اگر کسی کام کی ضرورت ہو تو دوسروں کی طرح آپؑ سے کہیں۔ چنانچہ ایک سفر میں لوگوں نے آپؑ کو پہچان لیا اور پوچھا کہ فرزندِ رسولؐ آپؑ نے ایسا کیوں کیا۔ اگر نادانستگی کی وجہ سے ہم لوگ آپؑ کی خدمت میں کوئی جسارت کر بیٹھتے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم ہی میں جاتے۔ آپؑ نے فرمایا کہ :

"ایک مرتبہ میں نے اپنے واقفکاروں کے ساتھ سفر کیا۔ وہ ہمارے ساتھ بہت زیادہ مہربانیاں کرنے لگے۔ لہٰذا خوف تھا کہ کہیں تم لوگ بھی وہی نہ کرنے لگو اس لیے میں نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔"

آپؑ اس طرح سے انسانیت و جوانمردی کے تمام اقدار کا لحاظ رکھتے اور باوجودیکہ اس خاندان کی جس قدر بھی خدمت کی جائے وہ کم ہے، لوگوں کی گزشتہ خدمت گزاریوں کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں چاہا کہ دوسرے لوگ میری خدمت گزاری کے فرائض انجام دیں۔ اس لیے آپؑ نے یہ شرط لگا دی کہ سب لوگوں کی طرح میں بھی کام کروں گا۔

واقعتاً ایسے ہی کردار اور ایسے ہی رہنما سے زندگی کا سبق سیکھنا چاہیے۔

حقِ صوم کی ادائیگی

ماہِ رمضان آپ کی حیرت انگیز بخشش کا پتہ دیتا ہے۔ آپ ان ایام کا استقبال اس طرح فرماتے ہیں :

"اے خدا! یہ ماہ رمضان ہے ، یہ روزہ رکھنے، عبادت و اطاعت کے لیے کھڑے ہونے اور یک بارگی خدا کی طرف رجوع کرنے کا مہینہ ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت و مغفرت کے دروازے کھول دیتا ہے، لوگوں کے گناہ بخشتا ہے، جہنم سے نجات دیتا ہے اور جنت خلد میں پہنچا دیتا ہے۔

حمد ہے اس خدا کی جس نے اپنے مہینہ، یعنی ماہِ رمضان کو اعمالِ نیک بجا لانے کا ذریعہ قرار دیا، روزے کا مہینہ اطاعت کا مہینہ ہے، بخشش کا مہینہ ہے اور راتوں کو جاگ کر عبادت کرنے کا مہینہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس ماہ کی شبوں میں سے ایک شب کو ہزار مہینوں سے بہتر قرار دیا ہے اور اس کا نام شب قدر رکھا ہے۔ ملائکہ اور روح حکم خدا سے اس شب میں ہر طرح کے احکامات لے کر نازل ہوتے ہیں۔

پروردگارا! تو محمدؐ و آل محمدؐ پر اپنی رحمتیں نازل فرما اور چونکہ ان شبوں میں سے ہر ایک شب میں تیری عفو و

بخشش کے سہارے بہت سے آزاد اور بخشش یافتہ
بن جاتے ہیں، اس لیے پروردگار تو مجھے بھی ان بندوں
میں شمار کر اور اس مہینہ کے بہترین اصحاب میں سے
قرار دے۔"

اس مہینہ میں آپؑ مخلوق سے کٹ کر خالق سے جاملتے۔ اس مہینہ
میں آپؑ اپنا دسترخوان ہمیشہ کشادہ اور کھلا ہوا رکھتے اور ان گھروں
میں افطاری بھیجتے جنھیں مانگنے کی عادت نہیں ہے۔

ماہِ صیام غلاموں کے آزاد ہونے کا مہینہ ہے۔ آپؑ اس مہینہ میں
غلاموں سے کام نہیں لیتے تھے۔ اور ان سب کے کرنے والے کام خود انجام
دیتے تاکہ غلاموں کو عبادت کے لیے کافی وقت ملے۔

عید الفطر کی شب میں آپؑ اپنے سب غلاموں کو اپنے سامنے بلاتے
اور ان میں سے ہر ایک کی تقصیروں کو گنواتے اس کے بعد ان غلاموں سے
فرماتے کہ سب خدا کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر یہ کہو:

"پروردگار جس طرح علی ابن الحسینؑ نے اپنے تمام غلاموں،
کنیزوں اور خادموں کی تقصیروں کو بخش دیا ہے تو بھی ان
کی تقصیروں کو بخش فرما۔"

"اے علی ابن الحسینؑ اس دن کو یاد کرو جس دن تمھارا نامۂ
اعمال تمھارے سامنے پڑھ کر سنایا جارہا ہوگا، اس دن کو
یاد کرو کہ جس دن خداوند قادر و حکیم کی بارگاہ میں اپنی پوری
زندگی کا ماحصل پیش کروگے۔ وہ عادل کی بارگاہ ہوگی
وہاں ایک شخص کا عمل کسی دوسرے شخص کے حساب میں

نہیں ڈالا جائے گا۔ خداوند عالم خود اپنے بندوں کے
افکار و رفتار و کردار کا شاہد ہوگا۔ پروردگار جس طرح
امام زین العابدینؑ نے ہم لوگوں کی خطاؤں اور تقصیروں
کو معاف کیا ہے، اسی طرح تو بھی ان کی خطاؤں اور
تقصیروں کو معاف کر۔"

اور خود آپؑ اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر یہ عرض کرتے:

"پروردگارا! تونے مجھے حکم دیا کہ میں اپنے زیردستوں
اور خادموں کی تقصیروں کو معاف کردوں لہٰذا میں نے
معاف کردیا، میں نے درگزر کیا اب تو بھی میری
تقصیروں کو معاف فرما۔"

"تونے حکم دیا کہ کسی سائل کو محروم نہ کرنا۔ میں نے کسی
سائل کو محروم نہیں کیا۔ اب میں تیری بارگاہ میں سائل ہوں،
مجھ فقیر و مسکین و بے نوا کو بھی اپنی بارگاہ سے محروم نہ فرما۔"

اس عاجزی و فروتنی کے بعد آپؑ اپنے غلاموں کی طرف متوجہ
ہوتے اور فرماتے:

"میں نے تم لوگوں کی خطاؤں کو درگزر کیا۔ بتاؤ تم لوگوں
نے بھی میری کوتاہیوں کو جو تمھارے بارے میں سرزد
ہوئی ہیں درگزر کیا؟"

آپؑ معصوم ہوتے ہوئے بھی یہ تمام امور انجام دیا کرتے۔
اس کے بعد ان سب کو آزاد کردیتے اور ہر ایک کو کچھ رقم بھی دیتے۔
اس طرح امام زین العابدینؑ ماہِ رمضان کو بہترین انداز سے اختتام

تک پہنچاتے مگر پھر اس کی جدائی میں بے چینی کا اظہار فرماتے :

" اے خدا ! اے وہ ذات کہ جو اپنی عطا پر کوئی بدلہ نہیں چاہتا اور بخشش کر کے پشیمان نہیں ہوتا ، اگر تو بخش دے تو تیری بخشش وابستۂ منت و احسان نہیں اور اگر نہ بخشے تو یہ تیرا ظلم نہیں ۔

پروردگارا ! تو نے ماہِ رمضان کے روزوں کو تکالیفِ شرعیہ میں سب سے بڑی تکلیف اور واجبات میں عظیم ترین واجب قرار دیا ہے ۔ یہ مہینہ ہم لوگوں کے درمیان چند دن رہا ، یہ بڑا اچھا دوست تھا ۔ اس نے ہم لوگوں کو بڑا فائدہ پہنچایا اور جب اس کا وقت گزر گیا اور اس کی مدت ختم ہو گئی تو اس نے جانے کا ارادہ کر لیا ۔ پس ہم اسے وداع اور رخصت کرتے ہیں مگر اس کی جدائی ہم لوگوں پر بہت شاق ہے ۔"

لیکن امام علیہ السلام صرف ماہِ رمضان میں ہی روزہ نہیں رکھتے تھے بلکہ آپؑ کی ایک کنیز بیان کرتی ہے کہ :

" میں نے کبھی آپؑ کو دوپہر کو کھانا کھاتے اور رات کو بستر پر سوتے نہیں دیکھا ۔"

وہ کہتی ہے کہ آپؑ ہر روز صوم سے رہتے ، عبادت کرتے رہتے اور ہر شب جاگتے اور نماز پڑھتے رہتے تھے ۔

مال سے سلوک

صدقاتِ امامؑ سے ان کی اعلیٰ درجہ کی سخاوت کا پتہ چلتا ہے ۔ اس سلسلہ میں آپؑ کا ہاتھ ہر آن کھلا رہتا تھا کہ جسے دیکھ کر حضرت امیرالمومنینؑ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی ۔ راتوں کو بھیس بدل کر غذا اور طعام کے تھیلے نیز درہم و دینار اپنے دوش پر رکھ کر مفلسوں اور حاجتمندوں کے گھر پہنچایا کرتے ۔ اکثر اوقات تو کسی کو اپنے ہمراہ مدد کے لیے بھی نہیں لیتے تھے ۔ آپؑ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے خدمت گاروں سے مدد لیں اور آپؑ کا یہ عمل لوگوں میں مشہور ہو اور اس طرح وہ بے چارہ مفلس و حاجتمند اپنے مددگار کو پہچان لے اور شرمندہ ہو ۔ آپؑ کے اس عمل نے مدینہ کے اندر پوشیدہ خیرات کرنے کا طریقہ رائج کر دیا ۔ کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ خیرات و صدقہ دینے والا کون ہے ۔ آپؑ خود فرماتے ہیں کہ پوشیدہ خیرات سے جہنم کے شعلے بجھ جاتے ہیں ۔

بعض اوقات تو لوگ آپؑ کو برا بھی کہتے کہ آپؑ حاجتمندوں اور فقرا کی مدد کیوں نہیں کرتے حالانکہ سارا مدینہ جانتا تھا کہ یہاں کوئی مرد نیکوکار ایسا ہے جو شب کی تاریکیوں میں فقراء و مساکین کو ان کے اخراجات اور سامان پہنچایا کرتا ہے ۔ امامؑ نے کبھی یہ نہ چاہا کہ خود کو ظاہر کریں اور بتائیں کہ یہ پوشیدہ خیرات و امداد کرنے والے وہ خود ہیں تاکہ جن لوگوں کی مدد کی جا رہی ہے وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ فلاں شخص ہماری مدد کر رہا ہے اور پھر شرمندہ ہوں یا وہ لوگ جو آپؑ کی ملامت کرتے ہیں وہ اپنے اشتباہ و غلط فہمی پر شرمندہ ہوں ۔ آپؑ خود فرماتے تھے کہ جب میری آنکھ بند ہو جائے گی تو اہل مدینہ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کون شخص تھا جو فقرا کو رقم و غذا و لباس وغیرہ

فراہم کیا کرتا تھا۔ ہاں آپؑ کے انتقال کے بعد جب آپؑ کو غسل دیا جانے لگا تو آپؑ کے دوشِ مبارک پر سیاہ سیاہ گھٹے کے نشان لوگوں نے دیکھے اور سمجھ گئے کہ فقرا کے لیے اذوقہ کی جو بوریاں آپؑ اپنے کاندھے پر لے جاتے تھے یہ اسی کے نشان ہیں۔

امامؑ کی بخشش اور خیرات کا اندازہ اس وقت اور زیادہ ہوگا جب یہ ذہن میں رکھا جائے کہ عمالِ یزید کے وحشیانہ حملے اور لوٹ مار کے بعد اہلِ مدینہ کے افلاس اور ان کی اقتصادی حالت کیا رہی ہوگی۔

سچ ہے جو جُود و سخاوت آپؑ کے اندر تھی وہ کسی دوسری جگہ کہاں مل سکتی ہے۔ تاریخ بشر سوائے اس کے کہ اس جود و سخاوت کے سامنے تعظیماً سر جھکائے اور کچھ نہیں کرسکتی۔

امامؑ کی طرف سے قربانیاں اور ان کا فقرا و مساکین میں تقسیم کرنا بھی حیرت انگیز ہے۔ کبھی کبھی ایک ایک دن میں تلو ستّو گوسفند ذبح کراتے اور حکم دیتے کہ کھانا تیار کیا جائے اور لوگوں کو کھلا دیا جائے۔

معلّم سے سلوک

امامؑ اگرچہ خود علمِ امامت سے بہرہ ور تھے مگر اس کے باوجود معلّم اور اُستاد کا احترام کر کے اس کی شکر گزاری کا طریقہ بتاتے ہیں۔ علمی مسائل کے امامؑ کے ذریعہ عوام کی سطح میں پھیلنے کے وہ اثرات ہیں جو اسلامی تعلیمات کی خدمت کرنے میں کام آتے ہیں اور اسلامی معاشرہ کا پتہ دیتے ہیں۔

اسلام نے اپنے ظہور کے ساتھ ہر قسم کی اشرافیت کی ہمت

شکنی کی اور طبقاتی امتیازات اور حسب و نسب کی بنیاد پر افضلیت پر ضرب لگائی۔ لیکن چند نام نہاد رہبران جو رہبری کے لائق نہ تھے انھوں نے سیاست و حکومت کی کرسی پر بیٹھ کر ہدایت شروع کر دی۔ نتیجہ میں ایّامِ جاہلیت کا دَور پھر آگیا، طبقاتی امتیازات کا پھر سے رواج ہوگیا اور ایّامِ جاہلیت کی خصلتیں لوگوں میں پھر سے زندہ ہوگئیں۔ حد یہ ہے کہ اس زمانہ کے چند علما بھی اس نازیبا رواج سے متاثر ہو کر ایسے اقدامات کرنے لگے جس کا تعلق واقعاً روحِ علم سے دُور کا بھی نہیں ہے۔

یہ علما حضرات ان طلبا کو جن کا گناہ صرف یہ تھا کہ ان بے چاروں کی مائیں کبھی کنیزیں تھیں یا ان کے باپ کبھی غلام رہ چکے تھے، درس دینے سے پرہیز کرتے تھے۔ یہ لوگ اپنے حلقۂ درس میں غلام کو شریک کرنے سے انکار کر دیتے تھے حالانکہ وہ اس طرح درس و تدریس کو غلط خطوط پر لے جا رہے تھے اور درس صحیح طور پر نہیں دے رہے تھے۔

مگر امام علیہ السّلام نے اپنے عمل اور طریقۂ کار سے دین کی صحیح رُوح کو پیش کیا اور اس غلط رسم اور ناپسندیدہ رواج سے ٹکر لی۔ باوجودیکہ آپؑ کے علم و دانشِ بیکراں کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اور آپؑ کے افقِ فکر و قوتِ ذہن کے حدود کا کسی کو علم نہیں لیکن جہاں کوئی علمی مجلس منعقد ہوئی آپؑ وہاں پہنچ گئے۔ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ اس مجلس میں شریک افراد اصل و نسب میں کس معیار کے ہیں۔ آپؑ مغرور و متکبّر علما کی طرح نکتہ چینی نہیں کرتے تھے کہ مجلسِ علمی منعقد کرنے والے اور اس میں شریک ہونے والے آزاد ہیں یا آزاد کردہ غلام۔

لوگ آپؑ پر اعتراض کرتے تھے کہ آپؑ ایسے شخص کی منعقد کردہ مجلسِ

علمی میں کیوں شریک ہوتے ہیں جو ایک عرصہ تک غلام رہ چکا ہے اور اس سے علمی گفتگو کیوں فرماتے ہیں۔ اگرچہ آپؑ کو اپنے رہبر اور امامؑ ہونے کا علم تھا مگر اِس گفتگو کی وجہ سے اُس عالم کی قدر و قیمت میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو جاتا تھا اور پھر طبقاتی امتیاز کا نظریہ مجروح ہو جاتا تھا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ جس شخص کی علمیت پر آپؑ کو واقعی اطمینان ہوتا تھا اسی کی مجلس میں شریک ہوتے تھے۔ کیا اس کا سبب اس کے سوا کچھ اور ہو سکتا ہے کہ امام علیہ السلام علمی امور میں فروتنی کو یاد دلاتے تھے؟ آپؑ کو کسی اور سے علمی فیض حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن آپؑ کے وہاں تشریف لے جانے سے اس عالم کا مرتبہ بلند ہو جاتا تھا۔ آپؑ علمی گفتگو کے سلسلہ میں نسل اور خاندان کو بے حقیقت اور لغو سمجھتے تھے۔

مزدوروں سے سلوک

آپؑ کو مزدوروں کے حقوق کا اس حد تک خیال تھا اور ان کے ساتھ آپؑ کا رویہ ایسا انسانی تھا کہ سننے والے یقین نہیں کریں گے۔

ماہِ رمضان میں مزدُوروں کی مزدُوری اوّل ماہ میں ہی دے دیتے تھے کہ وہ معاشی فکروں سے آزاد ہو کر اطمینان سے اللہ کی عبادت کریں۔

جب آپؑ کسی غلام کو آزاد فرماتے تو اس کو کچھ رقم بھی عنایت فرماتے کہ وہ کوئی کاروبار کرے۔ ایک مرتبہ آپؑ کی کوئی کنیز آپؑ کے ہاتھ پر پانی ڈال رہی تھی کہ اتفاق سے وہ ظرف اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر امامؑ پر گر گیا۔ ایسے موقع پر ہر انسان کو فطری طور پر غصّہ آجاتا ہے اور اس بے توجہی پر سرزنش کرتا ہے۔ کنیز کو بھی شاید یہ انتظار تھا کہ اب امامؑ کو غصّہ آئے گا اور سرزنش کریں گے مگر آپؑ کے کرم اور اغماض نظر پر

بھروسہ کرتے ہوئے اس نے قرآن کی یہ آیت پڑھی:

" وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ " یعنی وہ لوگ جو غصّہ کو پی جاتے ہیں۔

یہ سُن کر امامؑ نے ارشاد فرمایا:

" میں نے اپنے غصّہ کو پی لیا "

جب کنیز نے اپنے امامؑ کی اس مہربانی کو دیکھا تو اسی آیت کے دوسرے فقرے کی تلاوت کی:

" وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ " یعنی اور لوگوں کی خطاؤں کو معاف کر دیتے ہیں۔

آپؑ نے فرمایا:

" اللہ بھی گناہوں کو معاف فرماتا ہے "

اس کے بعد آپؑ نے خود آیت کا تیسرا اور آخری فقرہ پڑھا کہ:

" وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ " یعنی اور اللہ نیکی اور احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ "لٰہذا جا میں نے تجھے اللہ کی خوشنودی کے لیے آزاد کیا۔"

کیا حاکم و محکوم، زبردست و زیردست کے درمیان اس طرح کا پُرخلوص میل ملاپ کہیں اور نظر آسکتا ہے؟

ایک موقع پر ایک شخص جو زمین کی آبادکاری اور کاشت کے لیے مقرر کیا گیا تھا، اُس کی سُستی کی وجہ سے کاشت خراب ہو گئی اور درختوں کو گزند پہنچا حالانکہ امامؑ نے اسے درختوں کی دیکھ بھال کی خصوصی ہدایت کی تھی۔ خرما کے جو درخت جہاں جہاں نصب کیے تھے، ایک روایت ہے کہ آپؑ نے نصب کرتے وقت ہر درختِ خرما کے نیچے

دو رکعت نماز پڑھی تھی۔ آپؑ نے اس کی کاہلی کو ملاحظہ کیا اور آپؑ کو سخت تکلیف ہوئی۔ تحریر ہے کہ آپؑ نے ایک طمانچہ رسید کیا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد اسے حاضر کیے جانے کا حکم دیا اور اس سے فرمایا کہ تو اپنا قصاص مجھ سے لے لے۔ یہ طرزِ عمل اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے کہ جب انسان بے انتہا روحانی عظمت کا حامل ہو۔ واقعتاً زین العابدؑ ایسی ہی ذات ہوتی ہے۔ مزدور انکار کرتا ہے اور آپؑ اسے آزاد فرما دیتے ہیں اور وہ ملکیت اور زمین جو کافی قیمتی تھی اس کو عطا فرما دیتے ہیں۔

ایک مرتبہ امامؑ کی طرف سے ایک دعوت میں ایک غلام سے کھانے کا برتن گر پڑتا ہے اور اس سے امامؑ کے ایک فرزند کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ آپؑ کی روحانی عظمت کو دیکھیے، اس دردناک حادثہ پر بھی آپؑ بالکل خاموش رہتے ہیں تاکہ مہمانوں کی تواضع کا کام ہو جائے۔ پھر مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد آپؑ اس غلام کو آزاد فرما دیتے ہیں۔

اہلِ علم سے سلوک

تا امکان، حقائقِ علمی کی نشر و اشاعت امامؑ کے اقدامات کے دائرہ میں ہوتا ہے۔ آپؑ علم کی سرپرستی کے ہر موقع سے کام لیتے تھے۔ یہ معلوم کرتے کہ علم و دانش اور دین میں کہاں تک ہم آہنگی ہے اور کسبِ کمال و معرفت کے متعلق اسلام کے مطمعِ نظر کو واضح فرماتے۔ آپؑ نے لوگوں کے لیے بہت سے فقہی مسائل کی تشریح فرمائی۔ نیز تفسیرِ قرآن جیسے سب سے زیادہ بنیادی کام کو انجام دیا اور اس آسمانی کتاب کے مضمرات و نکات لوگوں کو بتائے۔ اس سلسلہ میں آپؑ نے بتایا کہ قرآن مجید ایسی کتاب

ہے جو کسی خاص زمان و مکان میں محدود نہیں ہو سکتی بلکہ یہ ہر عصر اور ہر قرن کے لیے ہے۔

قرآن کے اندر بہت سے مضمرات ہیں۔ اس میں ہر زمانے کے لیے فرمان ہے۔ اوصیائے دین آیاتِ الٰہی کے اسرار کی کلید ہیں اور سوائے امام سید سجادؑ کے بھلا کس کا نزدیک تر رشتہ قرآن سے ہو سکتا ہے؟

امامؑ علمی مجالس میں شرکت فرما کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم علم کی خدمت کرنے والوں کے کاموں کے نگراں ہیں۔ ان کے اندر گرمیٔ عمل پیدا کرنے کے لیے علمی مجالس کو رونق بخشتے ہیں اور معلّم اور صاحبِ علم کا احترام اس کے علم کی وجہ سے کرتے ہیں۔

ایک شخص اپنے باپ کے قاتل کو امامؑ کی خدمت میں پکڑ لایا اور تکلیفِ شرعی کے متعلق دریافت کیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ اسلام کی رو سے تو یا قصاص ہے یا خون بہا اور اگر معاف کر دے تو بہتر ہے لیکن اس کے سینہ میں غیظ و غضب کی آگ بھڑک رہی تھی اس لیے وہ معاف کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ امامؑ نے اس سے پوچھا۔ اچھا یہ بتاؤ اس قاتل کا کوئی حق تمھارے ذمّہ ہے۔

اس نے جواب دیا۔ جی ہاں، میں نے اس کے مکتب میں درس لیا ہے اور اس کا شاگرد رہا ہوں۔

یہ سن کر امامؑ بے چین ہو گئے اور فرمایا:

"سن! جو تیرا حق اس قاتل پر ہے اس سے کہیں بالاتر اس کا حق تیری گردن پر ہے۔"[1]

---

[1] نقل از مجلہ درسہائے از مکتب اسلام، شمارہ ۶۰ صفحہ ۸

بہرحال امامِ وقت زمانہ کے لیے سب سے بڑا معلم ہوتا ہے اور تمام اہلِ عصر اس کے شاگرد ہوتے ہیں اور اس کی رہنمائی سے کسبِ فیض کرتے ہیں۔

عورت سے سلوک

حضرت امام زین العابدینؑ کی نظر میں عورت ایک ایسی نعمت ہے کہ جس کے پاس یہ نہیں ہے اس کی زندگی ناقص، اس کی عقل زائل، اور اس کا دل الجھنوں میں گرفتار رہتا ہے۔ یہی سب سوچ کر عورت کی قدر کرنی چاہیے۔

آپ فرماتے ہیں:

"تمھاری زوجہ کا حق تم پر یہ ہے کہ یہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو تمھارے آرام و آسائش کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ اللہ کی ایک نعمت ہے اس لیے تمھیں چاہیے کہ اس کے ساتھ مہربانی اور عزت کا سلوک کرو۔ مناسب یہ ہے کہ اس کے ساتھ نرمی برتو، اچھا کھلاؤ، اچھا پہناؤ اور اگر کوئی نادانی کی حرکت کر جائے تو اسے درگزر کرو۔"

خدمتگار اور غلام سے سلوک

معاشرہ میں خدمتگاروں اور غلاموں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ امامؑ اس سلسلے میں ہر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور بحیثیت انسان ان کی قدر و قیمت کو واضح کرتے ہیں۔

آپؑ اپنے خدمت گاروں سے بہت نرمی کا سلوک کرتے تھے اور یہ چیز دوسروں کے سلوک کے بالکل برعکس تھی۔ اسلام واقعی سے منحرف معاشرہ کی نظر میں غلام کی حیثیت ایک جانور کی سی سمجھی جاتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ جو چاہیں برتاؤ کریں۔ ان کا جان و مال سب کچھ ان کے آقا اور مالک کے لیے مباح ہے۔ وہ ان سے جو چاہیں کام لیں۔ مگر امامؑ کا سلوک ایک طرح سے سارے معاشرے کے مقابلہ میں ایک جہاد تھا اور اس طرح کے رسم و رواج کے خلاف ایک طرح کی جنگ تھی۔

اس زمانے میں زہری ایک عالم تھا اس نے سہواً اپنے غلام کو قتل کر دیا تھا اور اس کو اس کا احساس بھی نہیں تھا کہ اس نے کوئی جرم کیا ہے اور کوئی بھی شخص حتّٰی کہ اس زمانے کے علماء بھی اس واقعہ پر اس کو قابلِ مواخذہ نہیں سمجھتے تھے۔ گویا غلام بے چارہ انسان ہی نہیں تھا اور اس کی موت پر افسوس کرنا بھی غلط تھا مگر اس گلو فشردہ دور میں امامؑ کو احساس تھا کہ ان بے چارے غلاموں کو بھی زندہ رہنے کا حق ہے۔ ان میں اور دوسروں میں بحیثیت انسان ذرہ برابر فرق نہیں۔ ان کی جان بھی دوسروں کی طرح قیمتی ہے۔ اس بنا پر آپؑ نے زہری کو خط لکھا کہ تم ایک انسان کے قتل کے مرتکب ہوئے ہو تمھیں اس کا خون بہا ادا کرنا چاہیے۔

امامؑ جب کوئی غلام خریدتے تو اس کی قیمت زیادہ سے زیادہ دیتے اور جب اسے اپنے کام پر لگاتے تو اس کے استحقاق سے زیادہ اس کو مزدوری عطا فرماتے اور پھر چند دنوں کے بعد اس کو آزاد کر دیتے۔ کسی غلام کو ایک سال سے زیادہ نہ رکھتے اور ان سے اتنا عمدہ برتاؤ کرتے کہ انھیں یقین رہتا تھا کہ امامؑ کو کبھی غصہ نہیں آئے گا۔

ایک دن آپؑ نے اپنے کسی غلام کو آواز دی مگر اس نے کوئی ان سنی کردی جب اس سے اس کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ مجھے یقین تھا کہ آپؑ کوئی سزا نہیں دیں گے ۔ یہ سن کر امامؑ نے سجدۂ شکر ادا کیا کہ پروردگار تیرا شکر کہ تیرا ایک بندہ میری عقوبت سے خود کو مامون و محفوظ سمجھتا ہے ۔ پھر آپؑ نے اس غلام کو آزاد کر دیا اسی طرح جب بھی موقع ملتا معمولی سے معمولی بات پر اپنے حقِ مالکیت سے دستبردار ہوتے اور غلاموں کو آزاد فرماتے رہتے تھے۔

ماں سے سلوک

امام زین العابدینؑ اپنی پرورش کرنے والی دایہ کو ماں کی طرح عزیز رکھتے چونکہ آپؑ کی مادر گرامی کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے آپؑ کی پوری توجہ اپنی دایہ کی طرف تھی ۔ ان کو احتراماً ماں کہہ کر پکارتے اور جب وہ آپؑ کے پاس آتیں تو آپؑ ان کے ساتھ بہت لحاظ اور مدارات سے پیش آتے ۔ جب تک وہ کھانا نہ کھا لیتیں آپؑ غذا نہ نوش فرماتے اور ان کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز کرتے ، صرف اس خوف سے کہ مبادا جس لقمہ کی طرف میرا ہاتھ بڑھے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہی لقمہ ان کی دایہ اٹھانا چاہتی ہوں ۔ اس دایہ کو صرف اس لیے کہ اس کی ماں کنیز تھی، احترام میں فرق نہیں آنے دیتے تھے ۔ جب کبھی وہ امامؑ کے پاس آتی تھیں تو آپؑ یہ جانتے ہوئے کہ یہ کنیز زادی ہیں بہت کشادہ پیشانی اور گرمجوشی سے پیش آتے اور بے حد عزت و احترام کا اظہار فرماتے ۔ آپؑ کے اس طرز عمل کو دیکھ کر لوگوں کا طرزِ عمل بھی بدلا اور دوسروں نے بھی اسی طرح گرمجوشی دکھانی شروع کی۔

سعید بن مسیب ایک اتنا بڑا عالم تھا کہ سوائے امام زین العابدینؑ کے کسی کو اپنے سے بہتر نہیں سمجھتا تھا ۔ وہ معترف ہے کہ جب کبھی وہ امامؑ کی خدمت میں جاتا تو تیور پر بل پیدا کر لیا کرتا ۔ یہ عالم وہ تھا جو صرف انھیں لوگوں سے ملاقات کرتا جن کی ماں کنیز نہ رہی ہو ۔ غور کیجیے جس سرزمین کے پڑھے لکھوں اور عالموں کا یہ حال ہو اور ان کا جاہلانہ تعصب اور کور باطنی اس حد کو پہنچی ہوئی ہو کہ ان لوگوں سے ملاقات سے گریز کریں جن کی مائیں کبھی کنیز رہی ہوں تو بے پڑھے لکھے عوام کا کیا حال ہوگا۔

سعید بن مسیب کا سرِ راہ ایک شخص سے سامنا ہو گیا اور وہ اسی مذکورہ سبب سے کترائے ۔ اس شخص کو سخت تکلیف ہوئی مگر اس نے موقع کا انتظار کیا اور ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا ۔ یہاں تک کہ ان دونوں کی حضرت امام زین العابدینؑ سے راستہ میں ملاقات ہو گئی۔ سعید نے ادب سے سر جھکایا اور ان کی بڑی تعظیم و تکریم کی ۔ امامؑ آگے بڑھ گئے ۔ وہ شخص موقع کا تو انتظار کر ہی رہا تھا ، فوراً اس نے سعید سے امامؑ کا حسب و نسب دریافت کیا اور پوچھا کہ امامؑ کی والدہ کون تھیں ۔ سعید تاڑ گیا اور بولا ، ہاں میں سمجھ گیا لیکن انسان کی ذاتی فضیلت کا ماں اور باپ سے کوئی تعلق نہیں۔

واقعاً اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی مصلحت و حکمت تھی کہ امام زین العابدینؑ کی مادر گرامی آزاد خاتون نہ ہوں تاکہ آئندہ لوگوں کو معاشرہ کے اس ناقص اور غلط رسم و رواج پر ضرب لگانے کا موقع ہاتھ آجائے۔

باپ سے سلوک

آپؑ جیسی ہستی کو اپنے پدر بزرگوار سے جیسا سلوک کرنا چاہیے تھا وہ آپؑ نے کیا اور اس کی دلیل اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے کہ باپ نے کربلا کے خونی میدان میں اپنے اہلِ حرم سے پکار کر کہا کہ سید سجادؑ کو میدانِ جنگ میں نہ آنے دو، انھیں روکو تاکہ دنیا نسلِ آلِ محمدؐ سے خالی نہ ہو جائے۔

باپ کا یہ کہنا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ بیٹے سے پوری طرح راضی ہیں اور امینِ نسلِ رسولؐ کے وارث کی حیثیت سے ان کا تعارف کرا دینا چاہتے ہیں۔

اولاد سے سلوک

آپؑ اپنے فرزندوں کو اس طرح تربیت دیتے کہ امام محمد باقرؑ تو منشائے الٰہی کے مطابق درجۂ امامت پر فائز ہوتے ہیں اور زیدؒ کا بھی نمایاں ہستیوں میں شمار ہوتا ہے۔

بھائیوں سے سلوک

عاشور کے بعد امام زین العابدینؑ کا اگرچہ کوئی بھائی نہ بچا تھا مگر چونکہ تمام مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں اس لیے آپؑ تمام مومنین کے ساتھ بھائیوں کی طرح بہترین سلوک فرماتے۔ اور اس سے آپؑ کو بڑی تسکین ہوتی۔

غلاموں سے سلوک

غلاموں کی رہائی کو آپؑ آتشِ جہنم سے نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے اور اپنی بہت سی دعاؤں میں آپؑ نے اس کو گناہوں کی بخشش کا وسیلہ قرار دیا ہے۔

احسان کرنیوالوں سے سلوک

امام علیہ السلام اپنے ساتھ احسان کرنے والوں کو بھی نہیں بھولتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے احسانات کا شکر اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔ اگرچہ اللہ کی نعمتیں اور اس کے احسانات اتنے ہیں کہ اس کے ادائے شکر کا تصور بھی نہیں ہو سکتا لیکن جس قدر انسان سے ممکن ہے اسے شکر بجالانا چاہیے۔

ہم نشینوں سے سلوک

ہم نشینوں، ہمراہیوں اور رفیقوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی اہمیت جو آپؑ نے بیان فرمائی ہے ان پر آپؑ خود بھی عمل کرتے تھے۔ آپؑ ان لوگوں کے ساتھ خلوص و محبت کا سلوک فرماتے تاکہ انھیں نصیحتیں کر سکیں۔ آپؑ ان کی خطاؤں کو درگزر کرتے اور بہت مہربانی سے باتیں کرتے۔ اکثر اتفاق ہوتا کہ آپؑ کو اپنے اقربا سے تکلیف پہنچتی، لیکن آپ اس کا اظہار نہ فرماتے کہ مبادا وہ شرمندہ ہوں بلکہ باحسن وجوہ اس کو آگاہ کر دیتے۔ یونہی اخراجات کے لیے اوروں کی طرح آپؑ نے اپنے ابنِ عم (چچازاد بھائی)

(ا)بھی دیا مگر اس کو اعتراض ہوا اور بولا: "خدا برا کرے علی بن الحسینؑ کا مجھے تو کچھ دیتے ہی نہیں"۔ یہ بات آپؑ نے خود سُنی لیکن منہ پر نہیں لائے کہ کہیں اسے تکلیف نہ ہو۔

سفرِ مکہ میں ہمراہیوں سے آپؑ نے خود خواہش کی کہ کوئی کام میرے ذمّہ بھی سپرد کر دیا کریں۔ آپؑ ہمیشہ لوگوں کی دلجوئی اور ان کی رہنمائی فرمایا کرتے۔ دوستیوں میں آپؑ ہمیشہ اللہ پر نظر رکھتے۔ چنانچہ کسی نے آپؑ سے عرض کیا کہ میں آپؑ سے بہت محبّت کرتا ہوں یہ سنکر آپؑ فوراً اللہ کی طرف متوجہ ہوئے اور عرض کیا:

"پروردگارا میں تجھ سے پناہ چاہتا ہوں اس بات سے
کہ لوگ تیری وجہ سے مجھ سے محبّت کریں اور میں
تیرے نزدیک مبغوض و قابلِ نفرت بن جاؤں"

آپؑ کی اس فکر کو دیکھ کر آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ جو شخص اس طرح اللہ کے لیے زندگی بسر کرے، دوسروں کے ساتھ اس کا سلوک کیسا ہوگا۔ اور وہ سلوک بھی صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے۔

ہمسایہ کے ساتھ سلوک

ہمسایہ کی عزّت امامؑ کی نظر میں اس حد تک تھی کہ آپؑ فرماتے ہیں کہ:

"ہمسایہ کی عزّت کرو۔ اگر کوئی شخص اس پر ظلم کر رہا ہو
تو اس کی مدد کرو، مصیبت میں اس کو تنہا

نہ چھوڑو اور اس کی لغزشوں سے چشم پوشی کرو۔ اس
کی غلطیوں کو معاف کرو"

اور آپؑ اپنے ہمسایوں کے لیے یہ دعا فرماتے ہیں:-

"اے اللہ، تو ان ہمسایوں کو توفیق دے کہ وہ تیری سنّت کو قائم کریں۔ تیرے اچھے آداب اختیار کریں۔ اپنے کمزوروں کی مدد کریں۔ ان کی حاجت روائی کریں۔ بیماروں کی عیادت کریں، طالبانِ حق کی رہنمائی کریں۔ مشورہ چاہنے والوں کو اچھا مشورہ دیں۔ جو سفر سے واپس آئے اسے دیکھنے جائیں ان کے راز کو پوشیدہ رکھیں۔ ان کی عیب پوشی کریں مظلوموں کی مدد کریں۔ لباس و دیگر سامان کے ساتھ ایک دوسرے سے مواسات کریں۔ اپنے پاس جو کچھ ہے اس کو دوسروں کو دینے میں تکلّف نہ کریں۔ جو کچھ ممکن ہو دے دیں اور مانگنے سے پہلے دے دیں۔ پروردگارا! مجھے توفیق دے کہ میں ان کی بدی کا بدلہ نیکی سے دوں اور ان میں سے جس نے مجھے ستایا، میں اس کو درگزر کروں اور میں ان میں سے ہر ایک کے ساتھ حسنِ ظن رکھوں۔ ان کے کاموں کو بحسن و خوبی انجام دوں۔ عفت و پاکدامنی کے ساتھ ان سے چشم پوشی کروں اور ان کے ساتھ فروتنی سے پیش آؤں"

امام زین العابدینؑ تمام اہلِ مدینہ کو اپنا ہمسایہ سمجھتے۔ نصف شب میں ان کے گھروں کو جاتے اور جو کچھ ممکن ہوتا انھیں عطا فرماتے۔ ان کے قرضوں کو ادا فرماتے۔

ہشام بن اسماعیل مخزومی والیٔ مدینہ، امام زین العابدینؑ کے پڑوس میں رہتا تھا۔ وہ آپؑ کو سخت تکلیف پہنچاتا اور خاندانِ رسالت کے ساتھ اپنے امکان بھر بے ادبی کرتا۔ مگر جب اس کو معزول کیا گیا اور ولید نے اجازت دیدی کہ اس نے جس جس کے ساتھ جو جو ظلم کیے ہیں وہ اس کا انتقام لے لیں، امامؑ نے اس کی تمام گستاخیوں اور جسارتوں کو نظر انداز کیا۔ بلکہ خود ہشام جب آپؑ کو دیکھتا تو یہی امید رکھتا کہ اب آپؑ اسے بُرا بھلا کہیں گے مگر فرزندِ رسولؐ جن کا قول یہ ہے کہ:

"اگر تمھارا ہمسایہ تمھارے ساتھ جاہلانہ سلوک کرے تو تم
اس پر غصہ نہ کرو۔"

اپنے ہمسایہ کی دل جوئی کرتے اور فرماتے:

"اگر کوئی ضرورت ہو تو کہو، اگر کسی کے قرض دار ہو تو کہو
میں تمھارا قرض ادا کردوں۔"

آپؑ کے سلوک کا یہ نتیجہ تھا کہ آپؑ کی اتباع میں کسی نے اس سے کوئی انتقام نہیں لیا۔

قرض خواہوں سے سلوک

آپؑ کے قرض خواہوں کا معاملہ تو درکنار، آپ ہمیشہ بر بنائے مروت و سخاوت دوسروں کا قرض اپنے ذمہ لے لیتے اور اپنے وعدہ کے مطابق

اسے ادا فرماتے۔

امانت رکھنے والے بھی ایک طرح کے قرض خواہ ہی ہوتے ہیں اور آپؑ لوگوں کی امانتوں کے ادا کرنے کی اس حد تک تاکید فرماتے ہیں کہ ارشاد ہے:

ادائے امانت

"تم لوگوں کا ہمیشہ یہ فریضہ ہے کہ لوگوں کی امانتیں واپس کر دیا کرو۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے محمدؐ کو حق و صدق و نبوت و رسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا، اگر میرے والد بزرگوار حسین ابن علیؑ کا قاتل بھی اپنی وہ تلوار میرے پاس لاکر امانت رکھ جائے جس سے اس نے میرے باپ کو قتل کیا ہے تو میں وہ تلوار بھی بلا پس و پیش اسے واپس کر دوں گا۔"[1]

رہن داری

اپنی ذاتی ساکھ کو قائم رکھنے کے لیے جو لوگ اپنی کوئی چیز رہن رکھ کر قرض لیتے ہیں ان کو بھی آپؑ نے ایک بیش قیمت سبق دیا ہے۔ چنانچہ آپؑ نے ایک مرتبہ کسی شخص سے کچھ رقم قرض لی اور بطورِ ضمانت اپنی عبا کے چند دھاگے اس کے حوالے کردیے۔ پھر جب آپؑ نے اس

[1] ناسخ التواریخ جزو حضرت سجادؑ صفحہ ۹۰

کی رقم واپس کرنا چاہی تو اس شخص سے کہا کہ وہ ہماری عبا کے ضمانت والے چند دھاگے واپس کر دے۔ اور فرمایا:

"مجھ جیسا شخص اپنی ضمانت کو سبک اور بے قدر نہیں کرتا" ؎۱

دشمنوں کے ساتھ سلوک

آپؑ کے دشمنوں کو بھی آپؑ کی طرف سے حد درجہ مردانگی اور مہربانی کا سلوک نظر آیا۔ اگر کوئی شخص آپؑ سے گستاخی یا جسارت کرتا تو آپؑ اس سے انتقام نہ لیتے بلکہ حد درجہ فروتنی وانکساری اور مہربانی سے پیش آتے اور فرماتے:

"اگر تم سچ کہتے ہو تو اللہ مجھے معاف کرے اور اگر میں سچ کہتا ہوں تو اللہ تمھیں معاف کرے۔"

اس طرح کی گفتگو کر کے آپؑ دشمنوں کو ان کی دشمنی اور غلطی کی طرف متوجّہ کر لیتے تھے اور حکم دیتے تھے کہ:

"اگر یہ لوگ حاجتمند ہیں تو ان کی حاجتیں پوری کی جائیں، اگر بھوکے ہیں تو کھانا کھلایا جائے۔"

ہشام جو آپؑ سے حد درجہ بغض وعناد رکھتا تھا آپؑ اس کی بھی دل جوئی فرماتے۔ حالانکہ انتقام لے سکتے تھے مگر اس کو نظر انداز فرماتے۔

مروان بن حکم کے ساتھ آپؑ کا سلوک تو ناقابل یقین ہے جب اہلِ مدینہ نے حکومتِ یزید سے اظہارِ نفرت کے لیے شورش برپا کی،

؎۱ ناسخ التواریخ جزء حضرت سجاد صفحہ ۹۷

تو مروان کی ساری املاک معرضِ خطر میں آ گئیں اور اسے اپنے خاندان کے تحفظ کی فکر ہوئی۔ اہلِ مدینہ میں جس سے بھی رجوع کیا، سب نے تحفظ دینے سے انکار کیا۔ کوئی شخص اس کے گھر والوں کو اپنے پاس رکھنے پر راضی نہ ہوا۔ مروان بہت پریشان تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اگر لشکرِ شام اور لشکرِ اہلِ مدینہ میں ٹکراؤ اور تصادم ہوا تو ہر صورت میں بنی امیہ اور خصوصاً اس کے خاندان کا وجود خطرے میں ہے۔ اگر لشکرِ یزید کو فتح ہوئی تو اہلِ مدینہ انتقاماً بنی امیہ کو جو اُن کے دسترس میں ہیں، زندہ نہ چھوڑیں گے اور اگر اہلِ مدینہ کے لشکر کو فتح ہوئی تو اس کے فوجی فتح کے بعد اپنے مخالفین کو تہ تیغ کرنے سے باز نہ آئیں گے اور بنی امیہ کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں گے۔ اس طرح نجات کا کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔

اسی فکر میں سرگرداں اور پریشان تھا کہ کیونکر اپنی جان بچائے کیونکہ اہلِ مدینہ میں کوئی ایسا نہ تھا جس کے ساتھ اس نے بُرا سلوک نہ کیا ہو۔ اور یہی تو وہ شخص تھا جو دارالامارۃ میں بیٹھ کر حاکمِ مدینہ کو قتلِ حسینؑ پر ابھار رہا تھا۔ یہی وہ تھا جو ہمیشہ خاندانِ رسالت کے ساتھ نیش زنی کرتا رہا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ وہ اتنا بُرا ہے کہ کوئی اس کو پناہ دینے کے لیے تیار نہیں۔

اس اضطراب کے عالم میں اسے امام زین العابدینؑ کا اسمِ گرامی یاد آیا اور امید کی ایک کرن نظر آئی۔ سوچا کہ امامؑ اپنے زمانہ کے ایک عظیم ترین انسان ہیں۔ زہد وتقویٰ، عصمت وعفت کے معدن ہیں۔ مگر کیا وہ یہ عنایت کریں گے؟ وہ خوب جانتا تھا کہ اس نے امامؑ کے خاندان سے کتنی بدسلوکیاں کی ہیں۔ اس نے امام حسین علیہ السلام کے ساتھ جو جسارتیں کی ہیں،

کیا امامؑ اسے بھول جائیں گے ؟ مگر اسی امید وبیم کی کشمکش میں وہ امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور عرض کرتا ہے کہ میرے گھر والوں کو براہ کرم آپؑ اپنی پناہ میں لے لیں۔ امامؑ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی مہربانی اور بخشش کی مستقل ایک دنیا تھے۔ قبول کر لیا۔

سچ ہے اگر مروان بدترین انسان تھا تو امامؑ ایک بہترین انسان تھے۔ اگر مروان انتہائی بزدل انسان تھا تو فرزندِ فاطمہؑ شجاع ترین انسان تھے۔ سچ ہے آپؑ انتہائی پُرعظمت وروحانیت اور اندازہ وقیاس سے بالاتر دینی پیشوا تھے۔

اہلِ مشورہ سے سلوک

وہ ہمیشہ اپنے امور میں اللہ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اعلم زمانہ تھے۔ ان کے پاس علم لدنی تھا۔ ایسی ہستی اپنے کاموں میں سوائے خدا کے اور کسی سے کیا مشورہ کرتی۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"پروردگار میں تجھ سے خیر کا طالب ہوں اس لیے کہ تو ہر شے سے واقف ہے۔ جس کام کا کرنا بہتر ہو وہ بذریعہ الہام مجھے بتا دے اور اسے تو میرے لیے اپنی خوشنودی کا ذریعہ بنا دے تاکہ میں تیرے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کروں۔ اور شکوک و شبہات کو میرے دل سے نکال دے اور یقین پیدا کر، جو کچھ تیری مشیت کے مطابق مجھ پر گزرے میں اس پر راضی رہوں۔ جو بات تجھے

پسند ہے وہ مجھے ناپسند نہ ہو اور جو تجھے ناپسند ہے وہ مجھے پسند نہ ہو۔"

راہنما سے سلوک

امامؑ کا رہنما ان کا خدا ہے۔ امامؑ کے تمام اعمال اس امر کے گواہ ہیں کہ وہ کتنی اطاعت گزاری کے ساتھ اس عظیم رہنمائی کے لیے کوشش کرتے۔ فرماتے ہیں:

"اس خدا کی حمد کہ جو سب سے پہلا موجود ہے اور سب سے آخری موجود ہے۔ اس کے بعد کوئی موجود نہیں ہے۔"

اں خدا جو چاہتا ہے وہی کام آپؑ کرتے ہیں اور حتی المقدور کوشش فرماتے ہیں کہ اپنے اس عظیم رہنما کے بے حد وحساب لطف وکرم کے لائق کچھ شکر ادا کر سکیں۔

سائل کے ساتھ سلوک

آپؑ سائل کو اس طرح خوش آمدید کہتے ہیں کہ:

"خوش آمدید، تو نے میرے سامانِ آخرت میں اضافہ کیا اور اس دنیا کے لیے زاد و توشہ فراہم کر دیا۔"

آپؑ کا دسترخوان ہمیشہ گسترده رہتا تاکہ حاجت مند اور بھوکے سیر ہو سکیں۔

خود اللہ کی بارگاہ میں یوں سائل بنتے ہیں:

"اے خدا! اے حاجت مندوں کی آخری اُمید۔ اے

وہ ذات کہ لوگوں کو اپنے مقصد تک پہنچانا تیرے
ہاتھ میں ہے۔ اے وہ ذات کہ تو لوگوں کو اتنا دیتا
ہے کہ بے نیاز ہو جاتے ہیں مگر تجھ سے پھر بھی
بے نیاز نہیں ہوتے۔ اے وہ ذات کہ تجھ سے
دعا کا سلسلہ ہمیشہ رہے گا، کبھی منقطع نہیں ہو سکتا۔
پروردگارا میری تجھ سے ایک حاجت ہے، اس کا
حاصل کرنا میری طاقت سے باہر ہے اور میں اس کی
تدبیر سوچتے سوچتے تھک گیا ہوں۔ میرا نفس ان
لوگوں سے سوال کرنے کو کہتا ہے جو تجھ سے سوال
کرتے اور تیرے حاجت مند ہیں۔ گناہگاروں سے
اسی بنا پر لغزشیں ہوتی ہیں۔ لیکن میں تیرے انتباہ
پر غفلت سے ہوشیار رہا اور تیری توفیقات کی
وجہ سے لغزشوں سے بچ گیا۔
اور میں نے کہا سبحان۔ ایک محتاج دوسرے
محتاج سے کیا سوال کرے۔ ایک فقیر دوسرے
فقیر کے دروازے پر بھیک مانگنے کیا جائے۔ میں
جانتا ہوں کہ میں تجھ سے کتنا ہی بڑا سوال کروں
مگر وہ تیری غنا اور قدرت کے سامنے کچھ نہیں
ہے۔ میری آرزوئیں کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہوں، وہ
تیری رحمت کے سامنے بے حقیقت ہیں۔ پروردگار
میں نے تیرے فضل و احسان پر بھروسہ کرکے دعا

کے لیے زبان کھولی ہے۔ میں تجھے واسطہ دیتا ہوں خود
تیری ذات اور محمدؐ و آل محمدؐ کا کہ مجھے ناامید
واپس نہ کرنا۔"

امام زین العابدین علیہ السلام اس طرح ہمیں سبق دیتے ہیں کہ ہم لوگ
خدا کے سوا کسی مخلوق سے سوال نہ کریں۔

رازدار سے سلوک

کسی کا راز افشا نہ کرنا چاہیے۔ کسی کے راز کو راز رکھنا اس پر
سب سے بڑا احسان ہے اور اللہ سے بہتر لوگوں کے بھیدوں کا چھپانے
والا کون ہے؟

آپ فرماتے ہیں:

"اے خدا تیرا شکر کہ تو سب کچھ جانتے ہوئے بھی
گناہوں کا پردہ پوش ہے۔ واقف ہونے کے
باوجود درگزر کر دیتا ہے۔ ہم سب آلودۂ گناہ ہیں
مگر تو اس کو آشکار نہیں کرتا۔ ہم سے بُرے
اعمال سرزد ہوتے ہیں لیکن تو نے ہمیں رسوا نہیں
کیا۔ ہم کتنی ایسی برائیوں اور خطاؤں کے مرتکب
ہوئے کہ جن سے صرف تو آگاہ ہے، دوسرے کو
معلوم نہیں اور اس کو ظاہر کرنے کی تجھ سے
زیادہ کس میں طاقت ہے۔ مگر تیری رحمت
نے لوگوں کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے اور

تو لوگوں کے کانوں کے درمیان حائل ہو گیا "

آپؑ کا یہ سب کچھ فرمانا ہم لوگوں کے لیے نصیحت تھی کہ بُرے اعمال اور خوئے بد سے کنارہ کشی اختیار کریں۔

بدسلوکی کرنیوالوں سے سلوک

اپنے ساتھ بُرا سلوک کرنے والوں کو درگزر کرنا اور ان کے ساتھ نرمی سے پیش آنا آپؑ کے اندر بے حد تھا۔ آپؑ کوشش کرتے تھے کہ بدی کا جواب نیکی سے دیں۔

اور اس طرح آپؑ لوگوں کو سبق دے رہے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص اپنے باپ کے قاتل کو پکڑ لایا۔

امامؑ نے ارشاد فرمایا:

"ثبوت بہم پہنچنے کے بعد اس سے قصاص لینا چاہیے لیکن اگر معاف کر دیا جائے تو بہتر ہے"

مشرک قیدیوں کے ساتھ سلوک

اب ہم امامؑ کی وہ گفتگو سنیں گے جو آپؑ نے مشرک قیدیوں کے متعلق فرمائی۔ آپؑ فرماتے ہیں کہ:

"اگر تم نے کسی مشرک کو قیدی بنایا ہے اور اس میں تمھارے ساتھ چلنے کی طاقت نہیں اور تم اس کو اٹھا کر بھی نہیں لا سکتے تو اس کو آزاد کر دو۔ قتل نہ کرو اس لیے کہ تمھیں نہیں معلوم کہ

اس کے متعلق حکم امام کیا ہے "

معاشرہ انقلاب کی راہ پر

کوفہ اور شام کی شاہراہوں سے جو انقلاب برپا ہوا تھا، وہ تمام شہروں میں پھیل گیا۔ امام حسینؑ کی شہادت اور امام زین العابدینؑ کے خطبات نے اپنا اثر دکھایا اور لوگوں کے لیے حکومتِ وقت کے اقدامات سے اپنی ناراضگی ظاہر کرنے کا سبب بنا۔

مکہ میں عبداللہ ابن زبیر نے سید الشہداؑ کی شہادت کو یزید کی مخالفت کا بہانہ بنایا اور اموی حکومت کے خلاف عَلمِ مخالفت بلند کیا۔ وہ خود حکومت کا خواہشمند تھا اور واقعۂ کربلا کے عوام پر اثرات سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا چنانچہ اُس نے عوام کی مدد سے سرزمینِ حجاز پر اپنا تسلط جما لیا۔

مدینہ کا وفد دمشق میں

مدینہ بھی چونکہ سید الشہداؑ کا وطن تھا اور خاندانِ محمدیؐ سے لوگوں کے تعلقات تھے۔ اس لیے لوگوں نے کھلم کھلا سب و شتم سے بیزاری کا اظہار کیا اور حکومت بنی امیہ کی طرف سے لوگوں کے خیالات میں تبدیلی آگئی چنانچہ وہاں سے کچھ لوگوں کا ایک وفد دمشق گیا تاکہ وہاں پہنچ کر حکومت کے روبرو اعتراض کرے۔[۱] مگر وہاں حکومت کی طرف سے ان کی سرگرم پذیرائی ہوئی تاکہ یہ لوگ اپنے اعتراضات سے باز آجائیں اور یہ بیان دیں کہ ہم نے وہاں کوئی برائی نہیں دیکھی۔ چنانچہ ان کو بہت سے عطیات و انعامات سے نوازا گیا تاکہ مدینہ واپس جا کر بنی امیہ کی حکومت کی بدنامی کی تحریزی نہ کریں۔ مگر ان تمام کوششوں کے باوجود جب یہ وفد مدینہ واپس آیا تو اس نے یزید کی بُری صحبتوں کا ذکر کیا اور یہ کہا کہ وہ کتے ساتھ رکھتا ہے، شراب پیتا ہے، فساد پھیلائے ہوئے ہے، لوگوں پر ظلم کرتا ہے اور ان لوگوں کا بیان یہ بھی تھا کہ:

> "ہم لوگ ایک ایسے شخص کے پاس سے آرہے ہیں جس کا کوئی دین نہیں۔ وہ شراب پیتا ہے، گانے بجانے میں مشغول رہتا ہے، کنیزیں اس کے سامنے گاتی بجاتی ہیں، کتوں سے کھیلتا ہے، کمینوں اور غلاموں کی صحبت میں بیٹھتا ہے۔ تم گواہ رہو کہ ہم نے اس سے خلع بیعت کر لیا ہے۔"

۱؎ سنہ ۶۳ھ

خدا کی قسم مجھے یزید نے ایک لاکھ درہم کا عطیہ دیا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس کے صحیح حالات تم لوگوں کو نہ بتائیں۔ خدا کی قسم وہ شراب پی کر اتنا مدہوش ہو جاتا ہے کہ نماز کو بھی ترک کر دیتا ہے"۔ [1]

اہل مدینہ نے یہ واقعات سننے کے بعد یزید کو خلافت سے معزول کرنے اور کسی دوسرے کو خلیفہ بنا دینے کا ارادہ کرلیا اور اسی دن عاملِ یزید کو شہر سے باہر نکال دیا اور خلع بیعت کا اعلان کر دیا۔ [2]

مدینہ پر فوج کشی

یہ خبر جب مرکز تک پہنچی تو یزید نے اس مخالفت کی سرکوبی اور اعتراضات کا گلہ دبانے کے لیے مسلم بن عقبہ معروف بہ مسرف کو کئی ہزار کی فوج کے ساتھ یہ حکم دے کر مدینہ بھیجا کہ اہلِ مدینہ کو کچل دے تین دن تک قتلِ عام جاری رکھ اور فوجیوں کو کھلی چھٹی دے دے کہ وہ اہلِ مدینہ کے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں اور اہلِ شہر کے جان و مال اور عزت و آبرو کو لوٹیں۔

جب یزید کا یہ غارتگر حاکم منزل پر پہنچا تو اس نے مدینہ کو فتح کیا اور حکم دیا کہ سارے شہر کو لوٹ لیا جائے۔ نتیجہ میں سارا شہر خون میں ڈوب گیا۔ تین دن تک خونریزی اور بدکاریوں کے بعد اب اہلِ مدینہ

[1] تاریخ طبری صفحہ ۳۰۰۹، ۲۱۴۱۵ سے عثمان بن محمد بن ابی سفیان

[2] مورخین نے ۶۳ھ تحریر کیا ہے۔

سے بیعت لینے کا وقت آیا۔ مگر اس کی یہ جرأت نہ ہوئی کہ امامؑ سے بیعت طلب کرتا۔ اگرچہ اس کے دل میں امامؑ کی طرف سے کوئی خلوص نہ تھا اس لیے کہ وہ مجسم بدی اور یہ مجسم خیر و نیکی، بھلا دونوں کا کیا میل۔ مگر دربارِ شام میں امامؑ کے مجاہدانہ کارنامہ کا ایسا اثر تھا کہ مسرف نے یزید کا مفاد اسی میں دیکھا کہ آپؑ سے بیعت نہ طلب کرے۔

اہلِ مکہ کی سرکوبی

اس طرح مسرف نے اہلِ مدینہ کی بغاوت کو فرو کیا اور اب عبداللہ ابن زبیر کی سرکوبی کے لیے مکہ روانہ ہوا۔ راستہ ہی میں واصل بہ جہنم ہوا لیکن مرتے مرتے حصین بن نمیر کو اپنا جانشین بنا گیا۔ حصین بن نمیر عقل و شعور سے خالی اور بے رحمی و جہالت سے بھرا ہوا تھا۔ عبداللہ بن زبیر کی سرکوبی کے لیے اس نے شہر مکہ میں آگ لگوا دی جس میں خانۂ کعبہ ہے۔ اس پر منجنیق سے سنگ باری کرائی اور اس کی بھی پروا نہیں کی کہ خانۂ کعبہ کو گزند پہنچے گا۔ اسی اثنا میں بنی امیہ کے خلیفہ یعنی یزید کی موت کی خبر ہر طرف پھیل گئی اور شام کی فوج مزید احکامات کے حصول کے لیے دارالحکومت یعنی دمشق واپس ہوگئی۔

معاویہ بن یزید کی خلافت سے دستبرداری

یزید جیسے قابلِ نفرت حاکم کے مرنے کے بعد اس کے لڑکے معاویہ بن یزید کے پاس خلافت آئی۔ امام زین العابدینؑ کی وہ

معرکہ آرائی جو آپؑ نے مقصد عاشورا کی اشاعت کے لیے فرمائی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اموی حکام کا کردار لوگوں کے سامنے آگیا اور حد یہ کہ معاویہ بن یزید مملکتِ اسلامی کا سربراہ بھی ہوش میں آگیا اور اسے معلوم ہوگیا کہ اموی سیاست بازوں نے کیا کیا حرکتیں کی ہیں۔
اس نے صفائی قلب کے ساتھ امام زین العابدینؑ کی باتوں کو اپنی تقریر میں دہرایا اور اپنے اسلاف کے جرائم اور غلط کاریوں کے متعلق پوری تفصیل دی۔ وہ کہتا ہے:

معاویہ بن یزید کی تقریر اور اپنے اسلاف کے جرائم کا اقرار

"میں جانتا ہوں کہ ہم بنی امیہ کا تم لوگوں کے ساتھ بُرا سلوک ہو رہا ہے اور تم لوگ ہم پر طعن و تشنیع اور اعتراض کرتے ہو۔ تم لوگ جانتے ہو کہ میرے دادا معاویہ نے اس ذات سے جنگ کی جو خلافت کے اس سے زیادہ اہل تھے، اس لیے کہ وہ رسولِ اکرمؐ کے سب سے زیادہ قریبی تھے، ان کا حق اسلام کی گردن پر تمام لوگوں سے زیادہ تھا، وہ سابق الاسلام تھے، آنحضرتؐ پر سب سے پہلے ایمان لائے تھے، ان کے چچازاد بھائی اور ذریت خاتم الانبیاءؐ کے باپ تھے۔ میرا دادا معاویہ ان سے الجھ پڑا اور اس نے جو کام

تم لوگوں سے لینا چاہا لیا۔ اور تم لوگوں نے بھی ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا۔ یہاں تک کہ وہ گرفتارِ اجل ہوا اور چل بسا اور اپنے اعمال میں گرفتار ہوا۔ اس کے بعد میرا باپ مسندِ خلافت پر آیا۔ وہ اس لائق نہ تھا کہ کوئی خیر و نیکی کرے۔ وہ اپنی خواہشاتِ نفس کا تابع رہا۔ وہ اپنے اشتباہات کو خوب جانتا تھا، لمبی چوڑی امیدیں رکھتا تھا مگر اس کی ساری اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ بالآخر موت آگئی اور اس کی درازدستی ختم ہوگئی۔ اس کی عمر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور اب اپنی قبر میں اپنے گناہوں اور ارتکابِ جرائم کی سزا کاٹ رہا ہے۔
سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ وہ بُری موت مرا اور اس کی عاقبت بھی بُری ہی ہوگی، اس لیے کہ اس نے پیغمبرؐ کی عترت کو قتل کیا، ان کی حرمت کو برباد کیا اور خانہ کعبہ تک میں آگ لگوائی۔"

یزید کا بیٹا خود یزید کی بُرائیوں کو دوبارہ سُنا رہا ہے اور بنی امیہ کی حکومت کے غیر اسلامی ہونے کا اقرار کر رہا ہے۔ لیکن چند ہی دن بعد وہ بھی مرگیا اور شاید بنی امیہ اور بنی مروان کے نجس و ناپاک افراد نے اس کی اس حق گوئی پر زہر پلا دیا کہ جس سے ممکن تھا کہ اہل اسلام بیدار

ہو جاتے اور حق حقدار کو واپس کر دیتے۔

بنی مروان کی حکومت

بہر حال معاویہ بن یزید کی موت کے بعد سلطنت بنی امیہ سے منتقل ہو کر بنی مروان کو پہنچی۔ اس سیاسی کشمکش اور مدینہ اور مکہ پر حملہ نے عوام کے جذبات کو ابھارا اور ایک بہت بڑے انقلاب کے لیے زمین ہموار ہو گئی اور زمانہ پُر آشوب ہو گیا۔

کوفہ جاگ اُٹھا

اہلِ مکہ اور مدینہ کی فریاد اور واویلا سے کوفہ بھی جاگ اُٹھا اور شورش برپا کرنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ اصولاً اہلِ کوفہ کو سب سے زیادہ اور سب سے پہلے گرفتارِ عذاب ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ یہی ان تمام مصائب اور شورشوں کی بنیاد تھے۔ ان ہی نے فرزندِ رسولؐ کو اپنے پاس آنے کی دعوت دی اور ان کی مدد و نصرت کا وعدہ کیا مگر جب ایفائے وعدہ کا وقت آیا تو انھوں نے اپنے وعدوں کے بالکل برعکس عمل کیا اور صرف یہی نہیں کہ فرزندِ رسولؐ کی مدد نہیں کی بلکہ ان کے مقابلہ میں تلوار کھینچ لی اور قتل تک کر دیا اور اب اس آگ کا دھواں جو ان لوگوں نے خود بھڑکائی تھی انھیں کی آنکھوں میں لگ رہا ہے اور خود انھیں کو تکلیف ہو رہی ہے۔ آلِ مروان کی حکومت ایسی بدی اور سخت گیری کی حکومت تھی کہ جس میں آئینِ اسلام کے خلاف ہر وقت کوئی نہ کوئی نغمہ چھڑا رہتا۔ یہ حکومت لوگوں کا استحصال کرتی، طبقہ بندیوں کے نظام کی بنیاد مضبوط کرتی اور ادھر اہلِ کوفہ اس امر پر تیار نہ تھے کہ ایسی حکومت

کو تسلیم کریں جو اسلام سے خیانت کرتی ہو، بیگناہوں کو قتل کرتی ہو، اسلامی اصولوں سے منحرف ہو اور قتل و غارت پیشہ ہو۔

ان کے سامنے امام حسینؑ آئینِ اسلام کا مکمل نمونہ تھے جنھیں ان سیاسی درندوں نے قتل کیا تھا لہٰذا انھوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ ایسی حکومت کی بنیاد کو ہلا دیں گے اور اکھیڑ پھینکیں گے اور شہید کربلا کے خون کا انتقام لیں گے۔ حادثۂ کربلا اور آلِ محمدؐ کے مصائب کی یاد ان کے کلیجہ میں آگ لگائے ہوئے تھی اور اس امر پر آمادہ کیے ہوئے تھی کہ اس کے ذمہ دار امراء و حکام سے جنگ کر کے اپنی گزشتہ تساہلیوں کی تلافی کریں گویا ان کے کانوں میں ہر وقت ایک شاعر کے یہ اشعار گونج رہے تھے:

"میں نے بنی ہاشم کے محلہ میں آلِ محمدؐ کے گھروں کو گھوم پھر کر دیکھا، پہلے تو یہ گھر بھرے نظر آتے تھے مگر اب بالکل خالی نظر آتے ہیں۔ پروردگار تو ان گھروں کو سلامت رکھ اور ان کو پھر سے آباد کر دے جو آج اپنے مکینوں سے خالی ہیں۔"

سچ ہے کہ شہیدانِ فخرِ بنی ہاشم کی شہادت سے مسلمانوں کی گردنیں جھک گئیں وہ دنیا کے سامنے بہت ذلیل اور رسوا ہوئے۔ یہ آلِ محمدؐ جو لوگوں کے لیے سرمایۂ امید و آرزو تھے، آج مصیبت اور بڑی مصیبت میں مبتلا ہیں۔

اب جس امیر و سرمایہ دار کی گردن پر ہمارے آقاؤں کا ایک

قطرہ خون بھی ہے وہ انشاء اللہ سزا سے نہیں بچ سکتا۔[1] سلیمان بن صرد خزاعی کے مکان میں اکابرین و روسائے شیعہ کا ایک اجتماع ہوا اور واقعہ کربلا پر انتہائی تاسف کا اظہار کیا گیا۔

مسیب بن نجبہ کی تقریر

مسیب بن نجبہ نے اللہ کی حمد و ثنا کی اور سید الشہداء کے ساتھ اہل کوفہ کی بے وفائی کا ذکر کر کے انتہائی پشیمانی کا اظہار کیا اور اب پوری دلیری کے ساتھ ہمدردی کرنے کو تیار تھا۔ وہ کہتا ہے کہ:

"ایسا ہوا کہ ہم لوگ آپ اپنی تعریف اور دوستوں کی داد و تحسین ہی میں لگے رہے کہ اتنے میں اللہ نے ہمارے نیکوکاروں کا امتحان لیا اور ہم لوگوں کو دو موقعوں پر جھوٹا پایا۔ ایک وہ موقع کہ جب واقعۂ کربلا سے پہلے دخترِ رسولؐ کے فرزند کے اتمامِ حجت کے لیے بہت سے خطوط ہم لوگوں کو پہنچے، ان کے قاصد و سفیر آئے اور آغاز و اختتام پر بظاہر و بہ باطن ہم سے نصرت کے طلب گار ہوئے مگر ہم نے اپنی جانیں بچائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہمارے قرب و جوار میں آکر شہید ہو گئے اور ہم لوگوں نے نہ ہاتھ سے ان کی مدد کی، نہ زبان سے ان کا دفاع

[1] کامل ابن اثیر ترجمہ عباس خلیلی۔ جلد ۵ صفحہ ۲۰۷

کیا، نہ مال سے ان کی مدد کی اور نہ اپنے قبیلے کو ان کی مدد کی دعوت دی۔ اب ہم لوگ اللہ کے سامنے کیا عذر پیش کریں گے اور اللہ کے رسولؐ کو کیا منہ دکھائیں گے کہ ان کا فرزند اور ان کی آل ہم لوگوں کے درمیان آکر قتل ہو گئی۔ خدا کی قسم اپنے پاس اس کا کوئی عذر نہیں۔ پس اب یہ ممکن ہے کہ ان کے قاتلوں کو اور ان لوگوں کو جنھوں نے امام حسینؑ کے خلاف ان قاتلوں کی مدد کی، انھیں قتل کریں یا خود قتل ہو جائیں۔ شاید اللہ ہمارے اس عمل سے ہم لوگوں سے راضی ہو جائے اور جب اللہ کی بارگاہ میں پہنچیں تو سزا سے بچ سکیں۔ لہٰذا اے لوگو! تم لوگ اپنے ہی میں سے ایک سردار منتخب کر لو۔ تمھیں اس سلسلہ میں ایک امیر اور ایک قائد کی ضرورت ہوگی تاکہ تم اس کی ہدایات پر چلو اور اس کے پرچم کے نیچے جمع ہو جاؤ۔ بس مجھے یہی کہنا تھا اور میں خدا سے اپنے لیے اور تمھارے لیے بخشش و آمرزش کا طالب ہوں۔"[1]

ان کی اس تقریر کے بعد چند اور لوگوں نے بھی تقریریں کیں اور اس پر

[1] تاریخ طبری صفحہ ۳۱۸۰

گفتگو ہوتی رہی۔ بالآخر لوگوں نے سلیمان بن صرد کو حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لیے اپنا امیر منتخب کرلیا۔

سلیمان بن صرد اصحابِ پیغمبرؐ میں سے تھے۔ انھوں نے سید الشہدار کی جانگداز شہادت کو یاد کرکے انتقامِ خونِ حسینؑ کی آواز بلند کی۔

انتقامِ خونِ حسینؑ کی تیاری

"ایہاالناس! اُٹھو تم سے اللہ ناخوش ہے اور اپنے اہل وعیال کے پاس اس وقت تک نہ جاؤ جب تک کہ اللہ کو راضی اور خوشنود نہ کر لو۔ اگر تمھیں امید نہیں کہ وہ تم لوگوں سے راضی ہو جائے گا تو جب تک کہ تم لوگ ان کے قاتلوں کو صفحۂ ہستی سے نہ مٹا دو یا خود نہ مٹ جاؤ، چین سے مت بیٹھو۔ موت سے نہ ڈرو، جو موت سے ڈرتا ہے، وہ ذلیل ہوتا ہے۔ اپنی تلواریں تیز کر لو، نیزوں کو درست کر لو، دیگر سامانِ جنگ اور گھوڑے وغیرہ فراہم کر لو اور جب تمھیں بلایا جائے تو فوراً آجاؤ۔"[1]

لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ خالد بن سعد کہتا ہے کہ:

[1] تاریخ طبری صفحہ ۳۱۸۲

"خدا کی قسم اگر مجھے یقین ہوتا کہ خود اپنے کو قتل کرکے میں اپنے گناہوں سے بری کر دیا جاؤں گا تو میں خود کو ہی قتل کر لیتا۔

میں خدا اور تمام مسلمانوں کو گواہ کرکے کہتا ہوں کہ میں اپنا سارا اثاثہ اس کام کے لیے مسلمانوں پر وقف کرتا ہوں، وہ اس سے سامان جنگ فراہم کرلیں، بجز اسلحہ کے جس سے میں اپنے دشمنوں سے جنگ کروں گا۔"[1]

اس کے بعد سلیمان پوری کوشش میں لگ گئے۔ وہ انتقام کی یاد ان کے حافظوں میں تازہ کرتے رہے اور جنگ کے لیے زمین ہموار کرتے رہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں شہر کوفہ کی فضاؤں میں "اے خونِ حسینؑ کا انتقام لینے والو" کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ جان کی بازی لگانے والوں نے تلوار اٹھائی اور سلیمان کے پاس پہنچ گئے، مگر اس مرتبہ پھر کوفیوں نے اپنی پست فطرت کا مظاہرہ کیا۔ دو رنگی چال چلے اور سلیمان کو بھی تنہا چھوڑا یعنی جن لوگوں نے اس کام کے لیے اپنی جان دینے کا عہد وپیمان کیا تھا ان میں سے نصف سے بھی کم لوگوں نے ان کی آواز پر لبیک کہی۔ مقام نخیلہ پر وہ سلیمان کے پاس پہنچے۔

سلیمان نے یہ دیکھ کر کہ اس وقت بھی کتنے ہمارے ساتھ ہیں اور کتنے نہیں، بہت کچھ اندازہ کرلیا کہ مسلمانوں کے دل میں اسلام کا کتنا درد ہے اور امام حسینؑ کے دل میں اسلام کا کتنا درد تھا اور پھر

[1] تاریخ طبری صفحہ ۳۱۸۳

یہ بھی کہ جناب مسلم بن عقیلؑ کا اس وقت کیا حال ہوا ہوگا جب ان کوفیوں نے آپؑ کا ساتھ چھوڑ دیا اور آپؑ کوفہ کی گلیوں میں تنِ تنہا جائے امن تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

یہ بھی محسوس کر لیا کہ سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کے دل پر کربلا میں کیا گزری ہوگی جب آپؑ کو دعوت دے کر بلانے والے خود آپؑ کے مقابلے پر تلوار کھینچ کر سامنے آ گئے۔

مگر سلیمان نے اپنے مقصد کے پیشِ نظر اپنی گفتگو یہ کہہ کر ختم کی۔

سلیمان کی تقریر

"ایہا الناس! جو شخص تقرب الٰہی اور حصولِ ثوابِ آخرت کے لیے آیا ہے، وہ ہم میں سے ہے اور ہم اس میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت دونوں میں ان پر رحم کرے گا۔ اور جو شخص دنیا اور دنیاوی نفع چاہتا ہے تو خدا کی قسم ہم لوگ مال غنیمت کی خواہش میں یہ قدم نہیں اُٹھا رہے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ پروردگار تو دیکھ رہا ہے کہ ہم لوگوں کے پاس نہ سونا چاندی ہے، نہ حریر و دیبا کے لباس بلکہ ہمارے دوش پر ایک تلوار ہے اور ہاتھ میں ایک نیزہ ہے اور زادِ سفر بھی صرف اتنا کہ ہم لوگ دشمن تک پہنچ سکیں۔ اب جس کے دل میں اس

کے علاوہ کوئی اور مقصد ہو وہ ہمارے ساتھ نہ آئے"۔[1]

یہ سن کر ان کے ساتھیوں نے کہا ہم لوگ تیغ کے پھل اور نیزوں کی انیاں کھانے چل رہے ہیں، اس کے سوا ہمارا بھی کوئی اور مقصد نہیں ہے۔[2]

سلیمان کا لشکر اور قبرِ حسینؑ پر حاضری

اب یہ لوگ نخیلہ سے باہر نکلے اور وہاں سے سیدھے مزار سید الشہداءؑ پر پہنچے۔ وہاں تا دیر آنسو بہاتے رہے، آہ و زاری کرتے رہے اور آپ کے ساتھ ہی ارادۂ شہادت کا اظہار کرتے رہے اور یہ کہتے رہے:

"پروردگار! ہم لوگ نواسۂ رسولؐ کی مدد نہ کر سکے، ہمارے گناہوں کو بخش دے کہ تو توبہ کو قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ حسینؑ اور اصحابِ حسینؑ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ پروردگار! ہم لوگ تجھے گواہ کر کے کہتے ہیں کہ ہم لوگ بھی اسی راستہ پر ہیں جس راستہ پر چل کر یہ لوگ شہید ہوگئے۔ اگر تو ہم پر رحمت نہ فرمائے گا، ہمیں نہ بخشے گا تو ہم لوگ آخرت کا خسارہ برداشت کرنے والوں میں ہو جائیں گے"۔[3]

مزارِ امامؑ پر پہنچ کر ان لوگوں کے دلوں میں شجاعت کی روح پیدا

---

[1] تاریخ طبری صفحہ ۳۲۲۰ [2] مورخین نے ۵ ربیع الآخر سنہ ۶۵ھ تحریر کیا ہے۔
[3] تاریخ طبری صفحہ ۳۲۲۶

ہوگئی اور وہ اس طرح کے اشعار پڑھنے لگے:

"ہم لوگوں نے قاتلانِ امام حسینؑ کو نیست و نابود کرنے کے لیے اپنا وطن، اپنے اہل و عیال، اپنا مال و منال سب کچھ چھوڑا۔ خدا کی قسم اگر ان قاتلوں کو تلاش کرتے ہوئے مغرب کے آخری سرے پر بھی جانا پڑے تو جائیں گے اور انھیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ ان سے جنگ کریں گے اور اگر شہید ہو گئے تو اس کی جزا جنت ہے۔"[1]

ایک اور شخص اس طرح کے اشعار پڑھتا ہے:

"لو وہ خود نکلے اور عنقریب ہم تک پہنچنے والے ہیں۔ ہم تو چاہتے ہی تھے کہ ان قاتلانِ امامؑ سے جنگ کریں۔ ان ظالم، بے دین اور گمراہ قاتلوں سے جنگ کریں۔"

"ہم لوگوں نے اپنے گھر والوں، اپنے مال و دولت اپنی پردہ نشین عورتوں تک کو نظر انداز کیا تاکہ اس منعم حقیقی کی رضا حاصل کریں۔"[2]

شامی لشکر سے مقابلہ اور خاتمہ

الغرض ان افکار و خیالات کے ساتھ توبہ کرنے والوں اور انتقامِ خونِ حسینؑ کے طلب گاروں کا یہ گروہ عین الوردہ تک پہنچا اور چند ہی

۱؎ تاریخ طبری صفحہ ۳۲۲۶ ۲؎ تاریخ طبری صفحہ ۳۲۲۸

دنوں میں شام کا لشکر بھی ان انقلابیوں کی سرکوبی کے لیے وہاں پہنچ گیا[1] آپس میں کشمکش کے بعد جنگ شروع ہوئی۔

ان میں کچھ لوگ اس لیے لڑ رہے تھے کہ اپنی جان بچائیں اور کچھ لوگ اس لیے لڑ رہے تھے کہ اپنی جان دیدیں اور درجہ شہادت پر فائز ہوں۔ یہ جانباز یہ چاہتے تھے کہ کربلا کے خونین میدان سے اٹھنے والی صدائے استغاثۂ امامؑ کا جواب دیں اور بتا دیں کہ ان تصوراتِ باطل کے خلاف آپؑ کی یہ صدا آپؑ کی شہادت پر ختم نہیں ہوئی بلکہ تاریخ انسانی میں ظالموں اور بیدادگروں کے خلاف یہ جنگ کا آغاز ہے اور یہ دکھا دیں کہ عاشور کے دن امامؑ کی آواز ظالموں اور ستمگروں کے خلاف جنگ کرنے کا اعلان ہے۔

یہ لوگ نہایت دلیری کے ساتھ لڑتے رہے اور اس وقت تک لڑتے رہے جب تک کہ موت نے ان کو خاموش نہ کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ بہادر جنگجو اپنے خون میں نہا گئے اور سلیمان بن صرد اور دوسرے بزرگانِ قوم نے اپنا یہ مقصد حاصل کر لیا۔ ان لوگوں میں سے بہت سے جانبازوں کے قتل ہو جانے کے بعد یہ جنگ ختم ہو گئی۔ مگر ان کے نعرے یہ بتا رہے تھے کہ اس جنگ کے لیے روانہ ہونے والوں میں سے کچھ لوگ طالب تقویٰ تھے اور کچھ اپنی گزشتہ کوتاہیوں اور گناہوں سے تائب ہو چکے تھے۔

انھوں نے مقام عین الوردہ پر فوج شام کا مقابلہ کیا اور اس وقت تک اپنی جگہ سے نہیں ہٹے جب تک کہ ان کے بزرگ اور سردار

۱؎ ابن زیاد کی سرداری میں

قتل نہ ہوگئے ۔ یہ لوگ شیروں سے بھی زیادہ دلیر تھے ۔ انھیں تو صرف وہ جنگ پسند تھی جس میں سر شگافتہ ہوں اور نیزہ بازی پر جنگ کا اختتام ہو۔

اس لیے جب تک بہت سے ظالموں اور حرام کو حلال کرنے والوں کو ختم نہیں کر لیا خود بھی ختم نہیں ہوئے ۔ انھوں نے انتہائی بہادری کے ساتھ شیروں کی طرح لڑ کر جان دی[1]

مگر اس کے باوجود کوفہ پھر بھی خاموش نہیں ہو سکا ۔ اس کے گلی کوچوں میں ایک مردِ اسیر اور خاتون کی آواز اب بھی گونج رہی تھی اور لوگوں کو بے چین کر رہی تھی اور اہلِ کوفہ کی بے وفائیوں کو یاد دلا رہی تھی۔

کوفہ کی پیشانی پر ابھی تک یہ دھبہ موجود ہے اس لیے کہ ابھی تک قاتلانِ شہدائے کربلا کو ان کے اعمال کی سزا نہیں ملی ہے ۔ پورا شہر ندامت سے اپنا سر جھکائے ہوئے ہے ۔ امام زین العابدینؑ اور حضرت زینبؑ کی یہ آواز اب تک شہر کی پوری فضا میں گونج رہی ہے کہ :

"تمھیں لوگوں نے ہم کو بلایا، پھر ہمارے مردوں کو دو نہروں کے درمیان پیاسا شہید کیا، پھر ان کی عترت کو رومی غلاموں اور کنیزوں کی طرح گلی کوچوں میں پھرایا"

اس لیے سلیمان کی یہ جنگ ان کی شہادت کے بعد بھی ختم نہیں ہوئی اور ان کا بلند کیا ہوا پرچم سرنگوں نہیں ہوا سلیمان کی جگہ

---

[1] ایک شعر کا کچھ حصہ جو کامل ابن اثیر جلد ۶ صفحہ ۳۲ پر مرقوم ہے۔

مختار ثقفی نے لے لی ۔ اور وہی 'یالثارات الحسینؑ' کی آواز[1] وہی 'انتقام، انتقام' کی صدا، وہی خونِ حسینؑ کے بدلے کی باتیں ہو رہی ہیں ۔

مختار ۔

انتقام کی تیاری اور انتقام

مختار جنگ کے لیے تیاری کر رہے ہیں اور کہتے ہیں :

"ہمارا تو دینی فریضہ ہے کہ ہم قاتلانِ حسینؑ کو زندہ نہ چھوڑیں ۔ ہم وہ نہیں کہ آلِ محمدؐ کی محبت کا دم بھی بھریں اور ان کے قاتلوں کو زندہ چھوڑ دیں ۔

اگر ہم نے ایسا کیا تو ہمیں بھی لوگ جھوٹا اور کذاب کے نام سے یاد کریں گے ۔

ان قاتلانِ امامؑ کے قتل کے لیے میں اللہ سے مدد کا خواہاں ہوں ۔

مجھے قاتلانِ امام حسینؑ کے نام بتاؤ، جب تک میں ان سب کو ختم نہ کر لوں گا مجھ پر کھانا پانی حرام ہے"[2]

مختار انتقامِ خونِ حسین کے لیے اُٹھے اور مالک اشتر کے بہادر فرزند ابراہیم بن مالک اشتر نے ان کی آواز پر لبیک کہی ۔

---

[1] کامل ابن اثیر جلد ۶ صفحہ ۷۲ [2] کامل ابن اثیر جلد ۶ صفحہ ۱۰۰

"پروردگار تو خوب جانتا ہے کہ ہم لوگ اولادِ رسولؐ کی طرف سے انتقام اور ان کے خون کا عوض لینے کے لیے آمادۂ جہاد ہیں۔ ہم لوگوں کو اپنی نصرت سے سرفراز فرما" ؎۱

لوگوں میں بھی ہر طرف شور تھا۔ ظالموں اور مجرمینِ روزِ عاشورا سے انتقام کا جوش جنابِ مختار کے رگ و پے میں سمایا ہوا تھا۔ اہلِ کوفہ ان کے ہمنوا ہو گئے اور سب نے تلوار اٹھالی۔

ناسخ التواریخ جلد ۱ میں اہلِ کوفہ کا بیان ہے کہ:

"جس وقت مختار نے لوگوں کو دعوتِ جہاد دی ہم لوگ ان کی مدد کے لیے سرخ و سفید گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے فوراً پہنچے ؎۲ جس لمحہ مختار نے طالبانِ انتقامِ خونِ حسینؑ کو آواز دی، سب سوار ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ اور خونِ حسینؑ کا انتقام لینے کے لیے تیزی کے ساتھ گھوڑے دوڑانے لگے۔"

اس طرح شہدائے کربلا کے قاتلوں سے انتقام کے لیے تلواریں نیام سے نکل آئیں اور ان لوگوں کو چُن چُن کر قتل کیا جانے لگا جو مظلومینِ کربلا کے قاتل تھے یا جنھوں نے لاشۂ امامِ مظلومؑ پامالِ

؎۱ کامل ابن اثیر جلد [illegible] صفحہ [illegible]۔

؎۲ ناسخ التواریخ [illegible] صفحہ [illegible]۔

سم اسپاں کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بغاوت شام کی سیاسی فضا کو بھلا کیونکر پسند آتی۔ اس نے ان شورش برپا کرنے والوں اور انتقام خونِ حسینؑ طلب کرنے والوں کی سرکوبی کے لیے ابنِ زیاد کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج روانہ کی۔

ابراہیم بن مالک اشتر اور ابنِ زیاد کی جنگ، ابنِ زیاد کا قتل

حق و باطل کی یہ دو طاقتیں مقامِ موصل پر ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں۔ ابراہیم نے پوری طاقت اور دلیری کے ساتھ دشمن کے قلبِ لشکر پر حملہ کیا اور تھوڑی ہی دیر میں ان کی تیغِ آبدار نے ظالم ابن زیاد کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیے۔ ؎۱

ان ایام میں شہرِ مدینہ دیگر شہروں کی نسبت ذرا پرسکون تھا۔ امام زین العابدین علیہ السلام اپنی ذات سے لوگوں کو علمی و روحانی ہدایت و رہبری سے سرفراز فرما رہے تھے اور انھیں درسِ زندگی دے رہے تھے کہ اسی اثنا میں خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک دن شہر کی فضاؤں میں یہ آواز گونجی:

"اے اہلبیتِ نبوت و معدنِ رسالت! میں مختار ثقفی کا فرستادہ ہوں اور اپنے ہمراہ عبید اللہ ابن زیاد کا سر لایا ہوں"۔

؎۱ [illegible]

ابنِ زیاد کا سر
امام زین العابدینؑ کی خدمت میں

اس وقت اتفاق کی بات ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام دستر خوان پر بیٹھے ہوئے غذا تناول فرما رہے تھے کہ[1] آپ کی خدمت میں ابنِ زیاد کا سر پیش کیا گیا۔ شاید اس وقت امامؑ کو کوفہ کے اندر ابنِ زیاد کا دربار یاد آگیا ہو کہ اس ناپاک کے سامنے دستر خوان لگا ہوا تھا اور وہ اپنے سامنے سرِ امام حسینؑ رکھے ہوئے اپنی چھڑی سے آپؑ کے لب و دنداں سے بے ادبی کرتا جاتا تھا اور یہ دیکھ کر امام زین العابدینؑ کا دل تڑپ اٹھا تھا اور آپؑ نے اللہ سے دعا کی تھی کہ پروردگار مجھے اس وقت تک موت نہ دے جب تک کہ میں اس منحوس کا سر بھی اسی طرح اپنے سامنے نہ دیکھ لوں۔ آپؑ نے ابنِ زیاد کا سر دیکھا اور لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بعد قتلِ حسینؑ یہ آپؑ کے لبوں پر پہلی مسکراہٹ تھی۔

۱؎ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ مکہ میں ہوا۔

امام کا ادائیگیٔ فریضۂ حج

تاریخیں گواہ ہیں کہ ایک زمانہ میں ایک انتہائی پُرشان و شوکت اور پُررعب و جلال قافلہ خانۂ کعبہ کی طرف حج کے لیے روانہ ہوا۔ اس قافلہ کا سردار خلیفۂ وقت عبدالملک کا فرزند ہشام تھا۔ ایامِ حج میں ایک دن اس نے تاجِ شاہی سر پر رکھا اور جامہ احرام پہنا اور اپنے اراکینِ سلطنت کی ایک بڑی تعداد کے حلقہ میں طوافِ خانہ کعبہ کے لیے چلا۔

لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ خانہ کعبہ کے جاہ و جلال کے سامنے اس کا جاہ و جلال کچھ نہیں ہے اور اللہ کی بڑائی کے سامنے ہر ایک کی بڑائی چھوٹی نظر آتی ہے۔ حدودِ حرم میں یہ زرق برق شاہی لباس کسی طرح بھی وہ مرتبہ و قرب حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ چونکہ ولیعہدِ سلطنت

تھا۔ ہر چند کوشش کی کہ طواف کرنے والوں کی صفیں اس کو راستہ دے دیں کہ وہ حجر اسود تک پہنچ کر بوسہ دے لیکن کسی نے راستہ نہ دیا۔ اراکین سلطنت نے بھی بہت کوشش کی مگر یہ ممکن نہ ہوسکا۔ لوگوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور اپنے طواف و دعا و مناجات میں مشغول رہے۔ ہشام کو بھی اوروں کی طرح رکنا پڑا تاکہ اپنے پورے اراکین کے ساتھ حجر اسود تک پہنچنے کا موقع مل سکے، حالانکہ ولیعہد کی حیثیت سے اب تک وہ جو چاہتا تھا فوراً ہوجاتا تھا۔ بالآخر اس نے جھنجھلا کر حکم دیا کہ اس اژدہام میں ایک بلند تخت اس لیے رکھ دیا جائے کہ وہ اس پر آرام سے کھڑا رہ سکے اور بھیڑ کم ہونے کا انتظار کرسکے۔ اسی اثنا میں ایک طرف سے ایک شخص نے نرم آواز کے ساتھ اللہ اکبر کی صدا بلند کی۔ اور فوراً ہی تمام حجاج اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئے اور مڑ مڑ کر اس کے نورانی چہرے کی زیارت کرنے لگے۔ ان کو دیکھتے ہی صفیں پھٹنے لگیں، ان کے لیے راستہ بنانے لگیں تاکہ امام زین العابدینؑ پہنچ کر حجر اسود کو بوسہ دے سکیں۔ اِس بے تخت و تاج کے رہنما کی طرف لوگوں کی یہ توجہ اور اُس صاحبِ اقتدار اور حکمراں کی طرف سے یہ بے توجہی دیکھ کر خلیفہ زادہ غصہ کی آگ میں جل اُٹھا کہ باوجودیکہ وہ ولیعہدِ سلطنت ہے، لوگ اس کی طرف توجہ نہیں دیتے جبکہ امامؑ کے چاروں طرف پروانوں کی طرح حلقہ کیے ہوئے ہیں۔

اس کے مقربین میں سے کسی نے ازراہِ شرارت یا ازراہِ سادگی ہشام سے پوچھا۔ یہ شخص کون ہے کہ جس کی لوگ اس قدر تعظیم کررہے ہیں؟

ہشام بن عبدالملک کا تجاہلِ عارفانہ اور فرزدق کا فی البدیہہ قصیدہ

ہشام باوجودیکہ فرزندِ رسولؐ کو خوب اچھی طرح پہچانتا تھا مگر اس نے جواب دیا کہ میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہے۔

اس کے اس جواب پر انھیں سخت تعجب ہوا کہ یہ کیسا ولیعہد ہے کہ اسلام کے اصلی رہبر کو نہیں پہچانتا۔ مگر اس مجمع میں ایک شاعر ابو نواس یعنی فرزدق بھی قریب ہی کھڑا تھا جو عرب کا ایک زبردست شاعر تھا۔ ہشام کا یہ تجاہلِ عارفانہ دیکھ کر اسے جوش آگیا۔ اس کے جذبات برانگیختہ ہوئے اور اس نے فی البدیہہ مندرجہ ذیل تعارفی قصیدہ سنایا:

"اے ہشام اگر تو ان کو نہیں پہچانتا تو مجھ سے سُن۔
یہ وہ ہیں کہ جن کے فضائل کو قرآن اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے۔
یہ وہ ہیں کہ جن کے دلیرانہ اقدام دیکھ کر شیروں کے دل کانپنے لگتے ہیں۔
یہ وہ ہیں کہ جن کی جود وسخا پر ابرِ باراں کو بھی رشک آتا ہے۔
یہ وہ ہیں کہ جن کے نشانِ قدم مکّہ پہچانتا ہے، انھیں خانہ کعبہ جانتا ہے۔ ان سے دنیا واقف ہے، ساری مخلوق ان کی شناسا ہے، ان سے حرم آشنا ہے۔

یہ اس خاندان کے فرد ہیں جو پورے روئے
زمین کے لیے باعثِ زینت ہے۔
انھی لوگوں نے اپنے علم کی روشنی سے ہمارے
لیے دین کی وضاحت فرمائی۔
ان حضرات نے اپنی سخاوتوں کی بارش سے
ہماری زندگی کو سرسبز و شاداب بنایا۔
یہ بہترین مخلوقِ خدا کا فرزند ہے۔
ان کے تقویٰ، ان کی پاکدامنی اور پاک طینتی کی
دُور دُور شہرت ہے۔
یہ وہ ہیں کہ ان کے دروازے سے کوئی سائل
محروم واپس نہیں ہوتا۔
یہ وہ ہیں کہ ان کی تعریف میں اگر کوئی شخص
اپنی دانست میں مبالغہ سے بھی کام لے رہا ہو،
تو اس کا یہ مبالغہ جھوٹ میں محسوب نہ ہوگا۔
یہ وہ ہیں کہ جن کے بازو ہنگامِ جہاد میں
سستی نہیں کرتے۔
یہ وہ ہیں جن کے جد حضرت محمد مصطفٰےؐ ہیں۔
یہ وصیِ رسولؐ کے فرزند ہیں، وہ وصیِ رسولؐ
جن کی تلوار نے بڑے بڑے کام انجام دیے۔
یہ وہ ہیں کہ جس کو ان کے ہاتھ سے کچھ مل
جائے، وہ کسی بخشش کے دریا کا نام بھی

نہ لے گا۔
یہ وہ ہیں کہ خالقِ کائنات نے ان کو بڑے
بڑے فضائل عطا کیے ہیں، ان کے جسم پھول
کے مانند تازہ اور نورانی بنائے ہیں۔
یہ فرزندِ فاطمہؑ ہیں۔
اگر تو انھیں نہیں پہچانتا تو سن۔ یہ فرزندِ
خاتم الانبیاءؐ ہیں۔
یہ وہی ہیں کہ جنھوں نے اپنے دشمنوں کے دامن
کو داغدار بنادیا۔
یہ وہ مردِ بہادر ہے کہ جس کی جسارت کا
مقابلہ شیر بھی نہیں کر سکتا۔
یہ حیدرِ کرارؑ کے فرزند ہیں کہ جن کے ہاں
حاجت مندوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اور دنیا میں
کوئی ایسا نہیں جو ان کا مرہونِ منت نہ ہو۔
یہ وہ ہیں کہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے
ہیں تو خدا ان کی مدد کرتا ہے اور جب زبان
کھولتے ہیں تو قرآن ان کی تائید کرتا ہے۔
یہ وہ ہیں کہ جس نے ان کا حق نہ پہچانا اس نے
اللہ کے حق کا انکار کیا۔
آپؑ کا نام بھی علیؑ ہے۔ آپؑ کے پدرِ بزرگوار
رازہائے قدرت کے امین تھے۔

یہ وہ ہیں کہ جن کی تعلیمات کی روشنی میں
اقوام و ملل و علماء راہ حق تلاش کرتے ہیں۔
یہ وہ ہیں جن کا قلم موتی برساتا ہے اور ہر
سمجھ دار ان کے درس کو دیکھ کر انگشت بہ لب
ہو جاتا ہے۔ جو ان کا بدخواہ ہوگا، وہ خود اپنا
نقصان کرے گا۔
یہ وہ امامؑ ہیں کہ قیامت کے دن جب دوزخ
کی آگ بھڑکے گی تو ان کی شفاعت اللہ کی
بارگاہ میں مقبول ہوگی۔
یہ وہ ہیں جو حاسدوں کے دلوں کو بھی پگھلا
دیتے ہیں۔
یہ وہ ہیں کہ جنھوں نے کبھی وعدہ خلافی نہیں کی۔
یہ وہ ہیں کہ جن کی انگشتہائے مبارک سے بخشش
کے دریا جاری ہوتے ہیں۔
اور تشہد کے سوا کبھی ان کے منہ سے 'لا' (نہیں)
نہیں نکلا اور اگر تشہد نہ ہوتا تو ہرگز ہرگز ان
کی زبان سے 'لا' نہیں نکلتا۔
یہ وہ ہیں کہ جو سراپا اللہ کی تلوار ہیں۔
یہ وہ ہیں کہ جو شخص ان سے منہ موڑے گا
خود اپنا نقصان کرے گا۔
جو ان سے دشمنی کرے گا وہ جہنم کی آگ میں

جلے گا۔
جو شخص اللہ کو پہچانتا ہے وہ ان کی فضیلت
اور برتری کو بھی جانتا ہے۔
اس لیے کہ ملت کو دین انھیں کے خاندان
سے ملا۔
یہ لوگ تاریکی میں چاند کی مانند چمکتے ہیں۔
یہ لوگ جس وقت حمد و ثنائے الٰہی میں
مشغول ہوتے ہیں تو بید کی طرح کانپتے ہیں۔
مگر جب نیزہ زنی کا وقت ہو تو اس طرح
ثابت قدم رہتے ہیں جیسے پہاڑ۔
یہ عزت و عظمت کی اس بلندی پر فائز ہیں
کہ کوئی مسلمان خواہ عرب ہو، خواہ غیرعرب،
اس بلندی تک نہیں پہنچ سکتا۔
یہ اس خاندان کے ایک فرد ہیں کہ جس کے
دسترخوان سے ساری مخلوق روزی کھاتی ہے۔
اگر قبیلۂ قریش کی نظر ان پر پڑ جائے تو
کہنے والا کہہ اٹھے گا کہ
عالی نبی انھیں سے شروع ہوئی اور ان ہی پر
ختم ہے۔
یہ وہ ہیں کہ جن کا چہرہ چاند سے زیادہ
روشن ہے۔

یہ وہ ہیں کہ زبانِ وحی پر جن کی شرافت و
بزرگی کے ترانے ہیں۔
یہ وہ ہیں کہ خوفِ خدا سے مسلسل جن کی آنکھوں
سے آنسو جاری رہتے ہیں۔
یہ وہ ہیں کہ جن کے دریائے وجود کا اصل
سرچشمہ سیرتِ پیغمبر ہے۔
ان کی طینت طیّب ہے۔ان کے اخلاق پاک
اور ان کی خصلت روشن و تابناک ہے۔
یہ وہ ہیں کہ جن کی فصاحت وہم و قیاس سے
بھی بالاتر اور جن کی سخاوت کے آگے حاتم
بھی دست بستہ ہو گیا ہے۔
کعبہ خوب جانتا ہے کہ اس کے صحن میں حجرِ
اسود کو بوسہ دینے کے لیے کون سا بندۂ معبود
آگے بڑھ رہا ہے۔
جس کی معطّر سانس سے پوری فضا خوشبوؤں
سے بس گئی ہے۔
اہلِ عقل ان کے حسنِ سیرت و کردار کو دیکھ کر
متحیّر ہیں اور ان کی آنکھیں ان کے حسنِ صورت
کو دیکھ کر کھُلی کی کھُلی رہ جاتی ہیں۔
اگر بالفرض ساری روئے زمین پر ضلالت کے
سیاہ پردے پڑ جائیں تو ان کی ہدایت کی روشنی

جو ان کے چہرے سے عیاں ہے، اُن تاریک پردوں
کو چاک کر دینے کے لیے اس طرح کافی ہے
جس طرح آفتاب رات کے تاریک پردوں کو
چاک کر دیتا ہے۔
یہ وہ ہیں کہ ان جیسی نجابت و شرافت
کسی انسان میں نہیں ملتی۔
یہ وہ ہیں کہ جو شخص ان کی ہدایات پر
عمل پیرا ہوگا وہ نجات پائے گا۔
اگر کوئی سائل ان سے سوال کرتا ہے تو اُدھر
شرمندگی سے اس کی نظر نیچی رہتی ہے اور اِدھر
یہ اپنی نگاہ نیچی رکھتے ہیں اور بالکل خاموش
رہتے ہیں، یہاں تک کہ سائل کے لبوں پر
مسکراہٹ آجاتی ہے۔
ان کے مجد و شرف پر سب لوگ یک زبان
ہیں۔ان کا چہرہ جیسے چودھویں رات کا چاند ہے۔
ان کے لباس کی خوشبو سے ساری فضا معطّر ہے۔
اس بلند نظر و دلپذیر مرد کے کھلے ہاتھ میں
ایک خوشبودار خیزران کا عصا ہے جو بدخواہوں
کو اندھا کر دینے کے لیے کافی ہے۔
خدائے کریم نے ان کو کمالات سے نوازا ہے،
ان کو جمالِ پرنور عطا فرمایا ہے اور ان کے

جد کے ذریعہ علمِ لدنی کا مالک بنایا ہے۔
یہ وہ ہیں جن کے سامنے تمام پیغمبران کم رتبہ نظر آتے ہیں اور جن کی امت کے مقابلہ میں دیگر انبیاء کی امتیں ناچیز اور بےحقیقت ہیں۔
یہ وہ ہیں کہ جن کی قدر و منزلت آسمان سے بھی بلند ہے۔
یہ وہ ہیں کہ جن کے اندر شکوہ ہی شکوہ اور جلال ہی جلال ہے۔
ان کے دستِ مبارک ہمارے لیے اللہ کی ایک نعمت ہے۔
ان کے دونوں ہاتھ ابرِ رحمت کی طرح سب کو فیض پہنچاتے ہیں۔
یہ جس قدر جس کو چاہیں بخش دیں، ان کی نعمت میں کوئی کمی نہیں آتی۔
اس روئے زمین میں ہر بڑے سے بڑا انسان ان کا شکرگزار ہے۔
یہ وہ گرامی منزلت انسان ہیں کہ اللہ ان کا مددگار ہے۔
یہ وہ صفاتِ حسنہ سے مزین انسان ہیں کہ جن کا کوئی مثل نہیں ہے۔
یہ ایسے نرم مزاج ہیں کہ کسی کو ان سے

گزند پہنچنے کا خیال بھی نہیں ہوتا۔
ان کے اندر دو خصلتیں بہت نمایاں ہیں، ایک خوش اخلاقی اور دوسرے بخشش۔
یہ ان لوگوں میں سے ہیں کہ جو صریحی خطا کو بھی معاف کر دیتے ہیں۔
مگر حاسدوں کو تو اللہ نے توفیق ہی نہیں دی کہ وہ ان سے فیض حاصل کریں۔
ان کی اتباع کرنے والے اللہ کے دریائے عفو و بخشش میں تیرتے ہیں۔
یہ لوگوں کے کاندھوں کا بوجھ ہلکا کر دیتے ہیں۔
یہ خوش اندام اور قدِ موزوں کے مالک ہیں۔
ان کے چاہنے والے ان کے دامِ محبت میں اسیر ہیں اور کیوں نہ ہوں۔
ان کی سیرتِ پاک رسولِ اکرمؐ کی سیرت کے بالکل مشابہ ہے۔
یہ کسی سے وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ کامل رعنائیت رکھتے ہیں۔ کشادہ رو ہیں۔
عزمِ محکم کے مالک ہیں۔ دونوں جہان کے فضائل و مناقب اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔
ان کا چہرہ کیا ہے گویا سعادتمندی اور خوش قسمتی کا آفتاب چمک رہا ہے۔ جود و

بخشش کا پرچم ان کے ہاتھوں کو چوم کر
خوشی میں جھوم رہا ہے۔
اہلِ عالم کو اپنے علم و احساس میں اس طرح
غرق کر دیا ہے کہ اب ان میں کور باطنی ،
تنگدستی اور افلاس باقی نہیں رہ گیا۔
یہاں حسنِ باطن کے ساتھ حسنِ ظاہر بھی
ہے اور یہ مقامِ مفاخرت پر یگانۂ روزگار
ثابت ہوں گے۔
ان کی افضلیت اور برتری اس حد تک ہے
کہ کوئی عالم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔
اے ہشام! تیرا یہ دریافت کرنا کہ یہ کون ہیں،
اس سے ان کی قدر و منزلت میں ذرّہ برابر بھی
کمی نہیں ہو سکتی۔
تو جس سے تجاہل برت رہا ہے، ان کو عرب
ہو یا غیر عرب، سبھی جانتے ہیں۔
یہ اس خاندان کی عظیم ہستی ہیں کہ جس کے
غلام تک عظیم بن جاتے ہیں۔
کیونکہ ان کی عظمت و بزرگی کی شہرت بلند
آسمانوں میں بھی ہے۔
اور ان کی مدحت و منقبت اطرافِ عالم
میں پھیلی ہوئی ہے۔

یہ اس نسل سے ہیں کہ جن کی محبت عین
دین ہے۔
اور ان کی دشمنی عینِ کفر ہے۔
ان کا تقرب ذریعہ نجات و سرمایۂ توسل ہے۔
تلواریں، نیزے اور قلم سب انھیں کی
خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔
اگر کوئی شخص ان سے دشمنی کرتا ہے تو کرتا
رہے، اللہ خود ان کا نگہبان ہے۔
ان کی تشریف آوری نے صفا اور حجرالاسود
کے دل کو مسرتوں سے مالا مال کر دیا ہے۔
اگر کعبہ کو معلوم ہو جائے کہ کون سی ہستی
تشریف لائی ہے تو وہ خود بڑھ کر اس کو
بوسہ دے گا۔
اور ہر اس مقام کو بوسہ دے گا جہاں انھوں
نے قدم رکھے ہیں۔
یہ اس نسل سے ہیں کہ خالقِ کائنات نے جن
کے راستہ کو روشن کر رکھا ہے۔
اور ان کی حجتوں اور دلیلوں کو قرآن کے
ذریعہ مستحکم بنا دیا ہے۔
ان کی زبان ہمیشہ سچائی پر قائم رہتی ہے۔
اگر ساری دنیا کے اہل تقویٰ کو دیکھا جائے

تو یہ ان سب کے رہنما اور سردار نظر آئیں گے۔

یا اگر سوال کیا جائے کہ تمام مخلوقات میں سب سے بالاتر اور بہتر کون ہے تو جواب ملے گا کہ یہی نسل اور خاندان۔

اہلِ ایمان ہمیشہ ان کے پرچم کے زیرِ سایہ رہتے ہیں۔

انھیں کی مشعلِ ہدایت سے لوگ روشنیٔ عقل پاتے ہیں۔

اور انھیں کی سرپرستی میں روحانی مرغزاروں میں چہل قدمی کرتے ہیں۔

دنیا کا کوئی صاحبِ بخشش ان کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔

یہ جو کچھ بخشش دیتے ہیں، دنیا کی کوئی قوم اور کوئی ملت اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔

پرہیزگاری اور خدا ترسی میں ان کا کردار دنیا کے لیے نشانِ راہ بنا ہوا ہے۔

ان کی شان ستاروں سے بھی زیادہ بلند ہے۔

میدانِ جنگ میں یہ لوگ شیر نظر آتے ہیں اور حیرت انگیز شیر۔

راہنمائی ایک ایسا پھل جو صرف انھی لوگوں

کے شاخسارِ ہدایت پر لگتا ہے۔

نیک بختی کا ستارہ صرف انھی کے آسمانِ مدحت پر طالع ہوتا ہے۔

افلاس بغیر ان کی شمشیرِ سخاوت کے خاک و خون میں غلطاں نہیں ہوتا۔

تنگدستی بغیر ان کی کشادہ دستی کے کم نہیں ہوتی، خواہ وہ خود توانگر ہوں یا تنگدست۔

انھی کے فضائل سے اعلیٰ درجہ کی خلعتیں سجائی جاتی ہیں۔

ان کے اقتدار کے سامنے بڑے سے بڑا صاحبِ اقتدار سر جھکائے نظر آتا ہے۔

یہ وہ ہستیاں ہیں کہ جب کوئی ناگوار حادثہ ہم لوگوں کی تلاش کو چلتا ہے تو ہم لوگ انھی کی محبت کے واسطہ سے ان آسیبوں کو دور کر سکتے ہیں اور اپنی نیکیوں اور نعمتوں میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

آفتابِ نصف النہار ان کی روشنی کا ہرگز ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتا۔

نہ کوئی دانشمند ان کی دانشمندی کی برابری کر سکتا ہے۔ نہ ابر ان کے بارانِ رحمت کی ہمسری کر سکتا ہے۔

ان کے دامن پر کبھی کسی بدی کی گرد نہیں بیٹھی۔
یہ عظیم ہستیاں ہیں، یہ صاحبانِ قدرت اور
نعمت بخش ہیں۔ ان کے تعجب خیز علم و
دانش پر مجھے حیرت ہوتی ہے۔
ان کے سخی ہاتھوں کی بارش نے ہمیں احسانات
میں غرق کر رکھا ہے۔
ان کی تیز نگاہوں کی چمک ہماری آنکھوں
کو خیرہ کر دیتی ہے۔
جب کوئی ناگوار حادثہ پیش آجاتا ہے اور اس
میں فیصلے کی ضرورت ہوتی ہے، تو سارے قریش
میں انھیں کا گھر ہے جس سے لوگ کسبِ نور
کرتے ہیں اور رائے صائب حاصل کرتے ہیں۔
ان کے پیروکاروں کے ایّام بہت خوش و خرّم
بسر ہوتے ہیں۔ ان کے دشمنوں کے ہاتھ بے کلائی
کے پنجہ کی مانند ہیں۔
ان کی ولایت کا سورج کسی کی آنکھ سے پوشیدہ
نہیں ہے، ان کی ولایت کی گواہیاں جنگِ بدر
درہ کوہِ احد، جنگِ خندق و فتح مکّہ میں ملیں
گی، جس وقت دشمنوں کی سخت یلغار تھی۔
ان کی تلوار نے جنگِ جمل میں کیسے کیسے معجزے
دکھائے۔ پھر جنگِ صفین میں ان کے نیزوں نے

کیا کیا خون بہائے اور جنگِ نہروان نے کتنی خون
کی نہریں جاری کیں۔ اس کے علاوہ
یوم خیبر و حنین، یہ دو شاہدین عادلین تو مشہور
ہی ہیں اور دوسرے غزوات بھی تاریخی شاہد ہیں۔
یہ خدا کے حکم کے مطابق حکم دیتے ہیں۔
ان کے فضائل ہر مسلمان کے نزدیک ثابت ہیں۔
قرآن ان کے نام کی نصیحت کرتا ہے۔
اور اس میں اللہ کے نام کے بعد ان کا نام آتا ہے۔"[1]

قوم کے اس سچے رہبر کے گرد لوگوں کا اتنا بڑا ہجوم اور اتنا پرجوش استقبال۔ ظاہر ہے کہ حکومت کا دل لرز گیا اور اس کو یہ خطرہ لاحق ہوگیا کہ یہ پیغامِ کربلا کی تبلیغ کرنے والا خود کوئی محاذ نہ کھول دے اور اس طرح بنی امیہ کی حکومت کا تار تار نہ بکھر جائے۔
سچ ہے اللہ کے بنائے ہوئے رہبر کا وجود بجائے خود ایک فریاد ہے، اس کا سکوت خود ایک استغاثہ ہے۔ اور زمانہ کے کسی دور اور دنیا کے کسی خطے میں بھی ظالم اور جفاکار لوگوں کی نظر میں ایسے صاحبِ فکر کو زندگی کا حق حاصل نہیں ہے۔
گمراہوں نے اپنی تلواروں اور اپنے مکر و فریب کے ذریعے ہمیشہ اس امر کی کوشش کی ہے کہ اللہ کے نیک بندوں سے حقِ حیات چھین

[1] شہیدانِ راہِ فضیلت، تالیف علامہ امینی ترجمہ فنسج صفحہ ۲۴۴ اور اصل قصیدہ کتاب "الکنی والالقاب، مؤلفہ حاج عباس قمی میں مذکور ہے۔

ہیں اور یہی نہیں بلکہ یہ لوگ ان کے نام یا ان کے ذکر کو بھی باقی نہیں رہنے دینا چاہتے اور اس فکر میں ہیں کہ کسی طرح عوام کے ذہن سے ان لوگوں کی یاد مٹا دیں۔

اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ہاں اس کے برعکس ہوتا تو تعجب تھا۔ اس لیے کہ اس مرتبے کے انسان زمانے کے ہر قرن اور تاریخ کے ہر دور میں، ہر آن میدانِ جنگ میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ برسرِپیکار رہتے ہیں، اس لیے کہ اگر وہ نہیں تو ان کا نام اور ان کی یاد لوگوں کو درس دیتی ہے اور ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ مگر ایک گروہ کا خیال ہے کہ ایسے لوگ خطرناک ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو عدل و انصاف اور نیکیوں کو پسند نہیں کرتے۔

یہی وجہ ہے کہ حاکمینِ وقت اپنے اپنے دور میں ملّتِ اسلامیہ کے کسی سچے رہبر کی بقا کو گوارا نہیں کرتے اور ان کی شہادت[1] کے اسباب پیدا کرتے ہیں۔

---

[1] ۱۲ یا ۱۸ یا ۲۵ محرم ۹۵ھ تاریخِ شہادت ہے (بعض مورخین دیگر سالوں کا بھی ذکر کرتے ہیں) اور آپ کو ولید بن عبدالملک یا اس کے بھائی نے زہر دیا، یہ بھی تحریر ہے۔

اتحادِ ملّتِ مسلمہ کی ایک سنجیدہ کوشش

علامہ محمد مہدی الآصفی کی گرانقدر تالیف

فلسفۂ امامت

جس میں امامت کے مفہوم کو جدید علوم کی روشنی میں سادہ و سلیس پیرائے میں بیان کیا گیا ہے سیاست اور حکومت کے سلسلہ میں امامؑ کے مقام کو واضح کیا گیا ہے مسئلہ امامت پر ملتِ اسلامیہ کے مختلف فرقوں کے مابین اختلاف کے اسباب بیان کیے گئے ہیں اور اسلامی فرقوں کو مفہوم امامت کے سلسلہ میں ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی گئی ہے

قیمت ۲۵/- روپے

آفسٹ طباعت

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

۲۰ - بی - ۴/۵ ناظم آباد نمبر ۲ کراچی